ان کے بھتیجے شفقت علاء الدین بیگ نے ۱۹۵۴ء کے بعد کے کلام کا یہ مجموعہ شائع کیا ہے جو غزلوں کے علاوہ بعض قطعات و متفرق اشعار پر بھی مشتمل ہے، یہ پورا مجموعہ مرزا صاحب کے سنجیدہ اور پاکیزہ ذوق کا نمونہ ہے، مرزا صاحب کو تغزل سے خاص مناسبت ہے، ان کی غزلیں حسن و عشق کی بلند اور لطیف اداؤں کی ترجمان اور جوش و طرب انگیز اور سرور و نشاط بخش ہونے کے علاوہ سوقیت و رکاکت سے پاک ہوتی ہیں، ان کا نغمہ حیات زلف دراز کے افسانے کو بے کیف کر دیتا ہے، وہ عشق کو طبیب روحانی اور حیات ابدی کا سرچشمہ سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک تغزل کی بزم کیف و نشاط میں نوحہ و ماتم کی کوئی گنجایش نہیں، اس لیے وہ ہجوم غم میں بھی جوش مسرت سے اچھل پڑتے ہیں، اور کوئی حرف شکایت زبان پر نہیں لاتے، جناب شفقت علاء الدین جو کام کرتے ہیں محنت، لگن اور سلیقہ سے کرتے ہیں، انھوں نے مرزا احسان احمد مرحوم کے کلام کا یہ مجموعہ بھی اہتمام، نفاست اور سلیقہ سے شائع کیا ہے، جس کے لیے وہ ہمت افزائی اور قدردانی کے مستحق ہیں، شروع میں انھوں نے مرزا صاحب کے حالات اور سیرت و کمالات بیان کیے ہیں، اور کلام کی خصوصیات بھی تحریر کی ہیں۔

انسان اور اس کا مستقبل :- مرتبہ جناب عبد الباسط قریشی صاحب۔ کاغذ کتابت و طباعت اچھی۔ صفحات ۵۲۔ قیمت درج نہیں، پتہ مکتبہ دار العلوم الاسلامیہ، بستی

یہ ایک مفید دینی و دعوتی رسالہ ہے، اس میں بتایا گیا ہے، کہ انسان کی منزل آخرت ہے، دنیا میں اسے خدا کا منشا پورا کر کے مستقبل کی زندگی کو سرخرو بنانا چاہیے، اور جنت حاصل کرنی چاہیے، مصنف نے اسلامی ارکان اور اخلاق و معاملات کے متعلق اسلام کی ہدایات بھی مختصراً تحریر کی ہیں، جو اخروی زندگی کی فلاح کی ضامن ہیں، اللہ تعالیٰ اس کا نفع عام کرے۔

"ض"

جلد ۱۲۶ ماہ محرم الحرام ۱۴۰۱ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۸۰ء عدد ۳

مضامین

شذرات

۱۷، ۱۸ جولائی ۱۹۶۳ء کو دہلی میں کل ہند انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام حیدر آباد کے مشہور ادیب، نقاد، صوتیات، لسانیات اور دکنیات کے ماہر جناب ڈاکٹر ابو الحسنات محی الدین قادری زور پر ایک سمینار ہوا، جس میں دہلی، یو۔پی، بہار، حیدر آباد اور پنجاب کے ارباب ذوق نے شرکت کی۔

ڈاکٹر زور کی وفات ۱۹۶۲ء میں ستاون سال کی عمر میں ہوئی، تصنیفی زندگی کے لیے یہ عمر زیادہ نہ تھی پھر بھی ان کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے تقریباً چھتیس ۳۶ چھوٹی بڑی تصانیف بطور یادگار چھوڑیں، اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ انھوں نے اکیس سال کی عمر میں اپنی قلمی سرگرمیاں شروع کیں اور اپنی عمر کے تیس سال تک آتے آتے وہ طلسم تقدیر، روح تنقید، تنقیدی مقالات، تین شاعر، فسانہ تازیانہ، تنقیدی مقابلہ، سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب، اردو کے اسالیب بیان، اردو شہ پارے، گارسان دتاسی، ہندوستانی صوتیات اور ہندوستانی لسانیات جیسی کتابوں کے مصنف ہو چکے تھے، اس عمر کے بعد ان کا قلم روکے نہیں رکا اور چلتا ہی گیا، ان کی کوشش اور خواہش رہی کہ حیدر آباد کے اردو ادیبوں اور خصوصاً یہاں کے شعراء کی عظمت اور فوقیت کا سکہ اردو کے ادبی حلقوں میں اچھی طرح بٹھایا جائے، اسی لئے انھوں نے یاد سخن، فیض سخن، متاع سخن اور مرقع سخن کی ترتیب دے کر وہاں کے شعراء کے کارناموں کو نمایاں کیا، حیدر آباد سے اپنی محبت کا اظہار "داستان ادب حیدر آباد فرخندہ بنیاد" لکھ کر بھی کی، پھر رسالہ سب رس کا اجرا اور ادارۂ ادبیات اردو قائم کر کے دکن میں اردو زبان و ادب پر کام کرنے کے لیے ایک شاہراہ بھی بنائی۔

انھوں نے اپنی قلمی سرگرمیوں میں سب سے زیادہ محنت سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلیات کی ترتیب دینے، اور اس کی شاعری کے رنگا رنگ پہلوؤں کو نمایاں کرنے میں صرف کی، ان کو اس سلطان سے شاید وہی عشق تھا، جو اس کو اپنی محبوبہ بھاگ متی یعنی حیدر محل سے تھا، جس طرح اس نے اپنی محبوبہ حیدر محل کے نام سے حیدر آباد کو بسا کر اس کو زندۂ جاوید کر دیا ہے، اسی طرح ڈاکٹر زور نے اس سلطان کو اس پر ایک طویل مقدمہ لکھ کر حیدر آباد کے محبوبوں کا محبوب بنا دینے کی کوشش کی ہے، اس کی شاعری پر تبصرہ اور اس کی حکومت کے کارنامے بیان کرنے میں ان کی تحریروں میں رقص و سرود کی محفل کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔

مگر جب وہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام کو الہامی قرار دیتے ہیں، تو اس سے کون اتفاق

کرنا پسند کرے گا، ان ہی کا بیان ہے، کہ رمضان اور محرم کے مہینوں کے سوا سلطان کی زندگی میں بہت کم لمحے ایسے ہوں گے جب شاہد و شراب و نغمہ اس سے دور رہتے ہوں، اسکی اس کردار نگاری کے بعد وہ اس کو ایک پختہ کار صوفی مشرب کہتے ہیں، اور اس کی تاویل یہ لکھ کر کی کہ "سمجھا جاتا ہے کہ عشق مجازی عشق حقیقی کا زینہ ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو ہمارے خیال میں سلطان محمد قلی سب سے زیادہ عشق حقیقی کے مراتب حاصل کرنے کا مستحق تھا، کیونکہ اس کی ساری زندگی عشق مجازی کی رنگ رلیوں اور رطے منازل میں گذری۔" ایسی تحریریں سنجیدہ اور مذہبی حلقہ میں کیسے قابل قدر سمجھی جاسکتی ہیں خود ان کی عثمانیہ یونیورسٹی کے بعض اسلامی ذہن رکھنے والے استاد کا یہ خیال رہا کہ سلطان محمد قلی شاہ کی نہیں بلکہ ہمیں حضرت معین الدین چشتیؒ کی ہمیشہ ضرورت رہے گی۔ واللہ المستعان۔

ڈاکٹر زور نے اس سلطان سے جو اپنا مبالغہ آمیز والہانہ لگاؤ دکھایا ہے، اس سے قطع نظر ان کی جو تصنیفی سرگرمیاں رہیں، ان سے متاثر ہو کر حیدر آباد کے لوگوں نے ان کو گوہر ارض دکن، اور جہرا شیخ حیدر آباد کے نام سے یاد کیا، انجمن ترقی اردو کے ارباب حل و عقد کو یہ خیال ہوا کہ شمالی ہند والے جنوبی ہند کے قابل قدر جوہر کو کیوں نہ وہی رتبہ دیں جس کے وہ مستحق ہیں، تو انجمن کے صدر جناب مالک رام صاحب جو اپنی وسیع المشربی، فراخدلی، رواداری اور اردو زبان و ادب سے فریفتگی کے لیے مشہور ہیں، زور صاحب پر ایک سمینار منعقد کرنے کی تجویز پیش کی، اور اس کو انجمن کے فعال، متحرک، سرگرم اور خوش سلیقہ سکریٹری جناب ڈاکٹر خلیق انجم نے ہر طرح کامیاب بنایا، اس سمینار کے مضامین ایک علحدہ مجموعہ میں شایع ہوں گے۔

انجمن ترقی اردو کے سالانہ جلسہ کے موقع پر یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ اب اس کی مالی پوزیشن خاطر خواہ ہے، حکومت کی تھوڑی سی سالانہ امداد اور اس کی مطبوعات کی فروخت کی آمدنی کے علاوہ اسکے اردو گھر کے مکانات کے کرایے سے اسی ہزار کی ماہانہ رقم مل جاتی ہے، یہ انجمن کے عہدیداروں خصوصاً ڈاکٹر خلیق انجم کا بڑا کارنامہ کہا جائے تو بجا ہوگا، اس مالی فارغ البالی کی وجہ سے اب اس کی طرف سے عمدہ کتابت، طباعت، اور خوبصورت گرد پوش کے ساتھ مفید کتابیں شایع ہو رہی ہیں، جن میں سے ایک "شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں" ہے، مولانا شبلیؒ کے بد باطن معاندوں نے ان پر عطیہ فیضی کے سلسلہ میں جو الزام تراشیاں کی ہیں، اس میں ان کی تردید مدلل، مسکت اور موثر انداز میں کی گئی ہے، اس کے مطالعہ سے بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی، اس کے مصنف جناب سید شہاب الدین دیسنوی ہیں، جو انجمن ترقی اردو کے نائب صدر بھی ہیں۔

شذرات

۱۹ اگست ۸۶ء کو دہلی کی غالب اکیڈمی کے ہال میں جناب مالک رام صاحب کی عمر کا اسی سالہ جشن منایا گیا جس میں ملک کے نامور ادیبوں اور شاعروں نے دل کھول کر اپنی اپنی محبت کے گلدستے اور عقیدت کے دستنبو کے ذریعہ ان کی خدمت میں پیش کئے، وہ اردو زبان و ادب خصوصاً غالبیات کی دل فریبی سے متاثر ہو کر موج خرام یار کی طرح جو گل کترتے رہے ہیں، اس سے کون واقف نہیں، عام خیال ہے کہ ان کی طرح جس نسل نے اردو کی خاطر تکلیف پر وہ داری زخم جگر اٹھائی ہے، اب کہیں ان ہی کے ساتھ ختم نہ ہو جائے، پھر اردو زبان و ادب کو مخاطب کرکے کہہ سکتے ہیں۔

غضب ہے شفتگی کے کوئی قابل نہ رہا ہوئی معزولی انداز و ادا میرے بعد

یا ممکن ہے کہ ان کی زبان پر یہ ہو۔ ع

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق

کیا عجب کہ یہ صلا رائگاں نہ جائے، کچھ لوگ حریف مے مرد افگن عشق ہونے کے لیے آگے بڑھ جائیں۔

کچھ دنوں پہلے ہمارے ملک کے ایک بدخواہ شہری چاندمل چوپڑا نے کلکتہ ہائی کورٹ میں یہ رٹ کیا تھا کہ اس ملک میں قرآن مجید کی طباعت و اشاعت ممنوع قرار دی جائے، مرکز اور بنگال کی حکومتوں کے قانون دانوں کی مدبرانہ پیروی سے اس کو ہائی کورٹ سے خارج کر کے مسلمانوں کے اشتعال کو فرو کیا گیا، مگر اسی وطن دشمن شہری نے صحیح بخاری صحیح مسلم اور دوسری احادیث نبویؐ پر پابندی عائد کرنے کے لیے کلکتہ ہائی کورٹ میں رٹ پٹیشن داخل کی، مگر ہائی کورٹ نے اس کو شر پسندانہ حرکت قرار دے کر مسترد کر دیا، اور درخواست دہندہ پر بطور ہرجانہ پانچ سو ایک روپے کی رقم ریاست کو ادا کرنے کا حکم بھی سنایا، اس قسم کی اشتعال انگیز حرکتوں کا مقصد مسلمانوں میں ہیجان پیدا کرنے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ یہاں کی زندگی میں غیر متحرک نہیں ہیں تو متحرک ہو جائیں، خواب غفلت میں ہیں تو بیدار ہو جائیں، سرگرم نہیں ہیں تو گرم نفس ہو جائیں، ملک کے نگہبانوں کو بھی سوچنا چاہئے کہ ایسے لوگ مسلمانوں کے دشمن ہیں، یا قومی یکجہتی، جذباتی ہم آہنگی اور وطن دوستی کی کشتی کو تباہی اور بربادی کے منجدھار میں غرق کرنے کے خواہاں ہیں۔

مقالات

سیرت نبویؐ اور مستشرقین

منٹگمری واٹ کے افکار کا تنقیدی جائزہ

از ڈاکٹر عماد الدین خلیل

المعهد الحضاری، الموصل، عراق

ترجمہ: عبید اللہ کوٹی ندوی، رفیق دار المصنفین

(۲)

سر ولیم میور کا بھی یہی دعویٰ ہے کہ نبیؐ کو اپنے پیغام کے بارے میں عالمی ہونے کا خیال بعد میں آیا، جب کہ بہت سی آیتوں اور حدیثوں میں یہ خیال موجود تھا، لیکن اس بارہ میں محمدؐ نے غور نہیں کیا، اور اگر غور کیا بھی ہو تو یہ زیادہ واضح نہیں تھا، اس لیے کہ وہ جس دنیا میں رہکر غور و فکر کرتے تھے، وہ عرب کی سرزمین تھی، اور دین جدید اسی علاقے کے لیے وضع کیا گیا تھا، محمدؐ نے آغاز بعثت سے انتہا وفات تک صرف عربوں ہی کو اپنا مخاطب بنایا تھا، دوسروں کو نہیں، چنانچہ ہمارا خیال ہے کہ اسلام میں بین اقوامیت کی جو بنیاد پڑی اور پھر برگ و بار لائی تو یہ کسی منصوبہ کے تحت نہیں بلکہ حالات اور ماحول کا نتیجہ تھا[1]، سر ولیم میور کے خیال پر نقد کرتے ہوئے آرنلڈ نے یہ جواب دیا ہے کہ

---

[1] از ندوہ۔ الدعوۃ الی الاسلام حاشیہ نمبر ۲ ص ۴۹-۵۰

اسلام کا پیغام عربوں تک محدود نہ تھا اس میں پوری دنیا شریک تھی صرف ایک اللہ اور ایک ہی دین کی طرف تمام لوگوں کو دعوت دی گئی تھی۔[1]

مستشرقین کی مذکورہ غلطی پر آرنلڈ کے علاوہ گولڈ زیہر نولدیکی اور سخاؤ نے بھی گرفت کی ہو سخاؤ نے اس بات پر زور دیا ہو کہ پیغام الٰہی عرب تک محدود نہ تھا، مشیت الٰہی ساری مخلوق کو محیط ہے، اس لیے ساری انسانیت کو اس کے سامنے سرنگوں رہنا تھا، اللہ کی طرف سے رسول ہونے کی بنا پر محمدؐ اپنے اس مطالبہ میں حق بجانب تھے، ان پر یہ فریضہ عائد ہوتا تھا، انھیں جن اصولوں پر عمل کرنا تھا، وہ جزئی حیثیت سے ابتدا ہی میں منظر عام پر آچکے تھے۔"[2]

کچھ مستشرقین اور خصوصاً سر ولیم میور نے ولہاسن سے مستفید ہو کر غزوۂ بنو قریظہ کے ذکر میں یہ لکھا ہے کہ حالات سازگار ہوتے ہی محمدؐ نے طاقت کا سہارا لے لیا، آرنلڈ نے اس خیال کی تردید تو کی ہے، مگر وہ خود ایک غلطی کا شکار ہو گیا، یہ لکھ کر) کہ

"محمدؐ ایک دین جدید کی تاسیس کے خواہاں تھے، جس میں وہ کامیاب ہوا لیکن اسی کے ساتھ انھوں نے ایک سیاسی نظام بھی دیا جو اپنی واضح خوبیوں کی وجہ سے بالکل ہی نیا تھا۔ ابتدا میں ان کی خواہش صرف یہ تھی کہ اپنے ہم وطنوں کو توحید الٰہی کی دعوت دیں۔"[3]

مطالعۂ سیرت کے لیے بنیادی شرط

سیرت فہمی ...... کے لیے یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ اسلامی تحریک قدم بہ قدم، اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے کامل منصوبہ کے مطابق اور قرآنی تعلیمات کی روشنی میں آگے بڑھتی رہی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پروگرام کو عملی شکل دی، اور اس سلسلہ میں انھوں نے جو طریقہ اختیار کیا اس میں آپؐ کی

[1] آرنلڈ۔ الدعوۃ الی الاسلام حاشیہ ص ۳۰ [2] ایضاً حاشیہ ص ۴۴ [3] الدعوۃ الی الاسلام حاشیہ ص ۵۵

صلاحیتیں، آپؐ کے اخلاق، آپؐ کی ذہانت، آپ کی منصوبہ بندی اور قوت تنفیذ پوری طرح جلوہ گر ہوئی۔ قرآن مجید کی آیتیں مختلف وقتوں میں خاص خاص مقدار میں نازل ہوتی رہیں، تاکہ مختلف... واقعات اور حالات میں ان پر عمل کیا جا سکے، مگر قرآن نظریاتی عقیدہ کی جن تفصیلات کو پیش کر رہا تھا، وہ پیشگی طور پر علم الٰہی کے موافق کامل اور متعین اصولوں پر مبنی تھیں، ان کی روشنی میں سیرت پاک کی تشکیل بھی منصوبہ الٰہی کے مطابق ہوئی، اس لیے سیرت پر "حالات اور ماحول" کے اثر کا افسانہ غلط ہے، تحریک اسلامی کی رفتار اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقدامات کا جائزہ لینے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم اس مقصد کو اہمیت دیں، جس کے لیے زمانہ کے عرف) اور حالات سے معرکہ آرائی اور ماحول سے کشمکش کا سامنا کرنا پڑا، یہ بات اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ اگر ہم یہ دیکھیں کہ جاہلیت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا حملہ اس وقت ہوا جب آپؐ نے لا الٰہ الا اللہ کی دعوت دینی شروع کی، وہ کون سے حالات تھے، جن کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا انقلابی اور مکمل نعرہ دیا جو جاہلیت کے سارے وجود کو اس کی تمام قدروں، بنیادی مقاصد، امتیازات رسوم و روایات اور اس کی معنویت ہی کو ختم کیے دے رہا تھا؟ ٹامس آرنلڈ نے اس حقیقت کو بڑی وضاحت کے ساتھ یوں لکھا ہے (

"یہ حقیقت نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ اسلام واضح طور پر بت پرست عربی خطہ میں ایک جدید تحریک بن کر ظاہر ہوا، دونوں کی پیدا کردہ سوسائٹیوں میں اخلاقی قدروں کے درمیان کس قدر تضادات تھے، عربی معاشرہ میں اسلام کی

آمد سے چند جاہلانہ رسموں ہی پر زد نہیں پڑی، بلکہ زندگی کی گذشتہ ساری روایتوں اور قدروں میں مکمل انقلاب آگیا، واقعہ یہ ہے کہ محمدؐ کی دعوت کے بنیادی مقاصد اس وقت تک عربوں کے نقطۂ نظر اور طرز زندگی کے برعکس تھے، عرب اپنے نظریات اور رسوم کی تعظیم اور تقدیس کرتے تھے، اور انھیں اس بات کی اچھی طرح خبر تھی کہ پہلے وہ جن کاموں کو نظر حقارت سے دیکھتے تھے، اسلام لانے کے بعد ان کو اب احترام کی نظر سے دیکھنا ہوگا۔[5]

قرآن ایک بلند اور بالاتر ہدایت نامہ ہے، اس کی آیتیں ہر زمان ومکان اور ہر نئے دور کے لیے انسانوں کی رہنمائی کا فرض انجام دیتی ہیں، قرآن مجید سلبی یا ایجابی طریقہ سے کسی صورت حال سے متاثر نہیں ہوتا ہے، حالانکہ مسیحی اور مادہ پرست مستشرقین کی اکثریت اسی خام خیالی میں مبتلا ہے، قرآن مجید کسی رد عمل کا آئینہ نہیں ہے، وہ تو زندگی کے تمام گوشوں پر محیط ہے، دراصل یہی وہ پہلو ہے، جس کو پوری طرح نہ سمجھنے کی وجہ سے استشراقی تحقیقات لغزشوں اور غلطیوں کے خارزار میں الجھ کر رہ گئی ہیں۔

مغربی محققین سے ہمارا یہ مطالبہ نہیں ہے، کہ وہ قرآن کو کتاب اللہ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول اللہ تسلیم کرکے اپنی تحقیق کا آغاز کریں، لیکن ان سے ہماری یہ خواہش ضرور ہے، کہ وہ اپنے ذاتی رجحانات سے مجرد ہوکر خالص معروضی طریقہ اختیار کریں اور پھر سیرت رسول کا ایک کامل وحدت کی صورت میں اور قرآن مجید کا ایک عقیدہ و دستور سے ہم آہنگ پروگرام کی طرح مطالعہ کریں، جو وقتی حالات سے بالاتر تھا، اس میں اگرچہ

[5] الدعوة الی الاسلام ص ۶۱-۶۲ تفصیل کے لیے دیکھئے گولڈزیہر کی کتاب
Muhammedanishe Stidien, Vol. I

زمان ومکان کے وقتی حادثات کا ذکر ہے، لیکن ان کے پس منظر میں جو قدریں اور ہدایات ہیں، ان کی جامعیت اور عمومیت سے مستشرقین کو غفلت نہیں برتنی چاہیے۔

مستشرقین کی تیسری غلطی

سیرت طیبہ کے افادی پہلوؤں کو مسیحی یا یہودی ماخذ کی طرف منسوب کرنا یہ تیسری غلطی بھی مستشرقین کے یہاں عام ہے، انھوں نے اپنے اسی خیال خام کی روشنی میں واقعات سیرت اور نبوت کا مطالعہ کیا ہے، چنانچہ ڈاکٹر جواد علی نے اس کے درج ذیل اسباب بیان کئے ہیں۔

مسیحی مستشرقین کی اکثریت، مذہبی طبقہ سے تعلق رکھتی ہے، یا مذہبی درس گاہوں کی تعلیم یافتہ ہے، وہ اسلام کے بنیادی موضوعات پر گفتگو کرتے ہوئے اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کا اصل ماخذ مسیحیت کو قرار دیں، اسی طرح اسرائیلی حکومت کے قیام اور صہیونیت کے غلبہ کے بعد یہودی مستشرقین کی بھی یہی کوشش رہی کہ عربی اور اسلامی روایات وامتیازات کو یہودی الاصل ثابت کریں، اپنے طرز عمل میں دونوں گروہ اپنے ذاتی رجحانات اور مذہبی جذبات کے زیر اثر نظر آتے ہیں۔[1]

اسلام اور مسیحیت کا فرق

طیباوی نے استشراقی ذہنیت اور اس کے مذہبی محرکات پر روشنی ڈالتے ہوئے، یہ لکھا ہے کہ اسلام کا مطالعہ کرتے ہوئے پہلی نظر میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ اسلام اور مسیحیت میں کئی موقعوں پر یکسانیت پائی جاتی ہے، لیکن گہری نظر سے دیکھا جائے تو دونوں کے درمیان بنیادی فرق واضح ہوجاتا ہے، ماضی میں عیسائی مشنریاں اور زمانہ حال میں اکاڈمیوں کی سطح پر مستشرقین نے اس یکسانیت کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا،

[1] تاریخ العرب فی الاسلام ج ۱ ص ۹-۱۱

وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نکتہ چینی کرتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ بندار مسلمان، مسیح کی کس قدر تعظیم کرتے ہیں۔ پینگن کے سلسلہ کی ایک کتاب میں ایک مستشرق نے جو پادری ہے تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے یہ ظاہر کیا ہے کہ اسلام، مسیحیت ہی کی صحیح یا تحریف شدہ تصویر ہے، ایک اور مذہبی شخص (ولفرڈ کینٹول اسمتھ) نے سرسری انداز میں اسلام اور مسیحیت کے درمیان یکسانیت کا ذکر کرتے ہوئے اس بات کی طرف ارشارہ کیا ہے کہ

"مسلمانوں اور عیسائیوں میں دوری کی وجہ ہے کہ دونوں نے ایک دوسرے کے عقیدہ کو اپنے ایمان وعقیدہ کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش کی ہے [1]

لیکن یہ تجزیہ درست نہیں، کیونکہ صدیوں سے عیسائیوں ہی نے اپنے مذہبی اصولوں کی روشنی میں اسلام کو سمجھنے یا دوسرے لفظوں میں اسے غلط طور پر سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ عیسائیت کے بارے میں مسلمانوں کا نقطۂ نظر ابتدا ہی سے ایک رہا ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، کیونکہ ان کی رائے قرآن سے ماخوذ تھی جو وحی الٰہی ہے، اس کے برعکس عیسائیوں کی مذہبی کتابوں میں جو تصریحات ہیں وہ ایک مسلمان کا نقطۂ نظر قبول کرنے میں حائل نہیں ہیں، مگر مسیحیت یا اسلام دونوں کے بارہ میں ایک مسلمان کے نقطۂ نظر کو یہ مستشرقین رد کر دیتے ہیں، چنانچہ لندن یونیورسٹی میں لیکچر دیتے ہوئے ایک مسیحی مبلغ انصاف اور معروضیت کے دعویٰ کے ساتھ یہ اعلان کرتا ہے کہ وہ اسلام کے بارے میں صحیح معلومات پیش کر رہا ہے، اس کے باوجود وہ کہتا ہے کہ

"اس بارہ میں اب کوئی شک نہیں رہا کہ محمد صلعم نے یہود اور کچی تحریف شدہ مصادر سے اپنے خیالات اخذ کئے ہیں، مسیحیت کے بارے میں بھی یہ بات کہی

[1] ڈاکٹر محمد البہی، الفکر الاسلامی الحدیث ص ۵۹۳ - ۶۰۱۔

جا سکتی ہے کہ غالباً محمد صلعم نے اس سے بھی استفادہ کیا ہے۔"

اس مبلغ مسیحیت کی معروضیت بے نقاب ہو جاتی ہے، اگر ہم اس کے لیکچر کا یہ اختتامی فقرہ بھی پڑھ لیں:

"ایک تعلیم یافتہ آدمی کو اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ کروڑوں مسلمانوں کے نقطۂ نظر کے مطابق اگر دنیا مسیح کی انجیل کو پیش کیا جائے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا [2]؛

تو کیا تبلیغی ضرورت سے انجیل میں ترمیم وتغیر کا جواز پیش کرنے والے کی حقیقت پسندی اور معروضیت کا یہی معیار ہے، وہ انجیل کے ساتھ جو بھی طرز عمل اختیار کریں مگر مسلمان قرآن کو مقدس امانت الٰہی سمجھتا ہے، جس میں تحریف اور ترمیم کا نہ پہلے کوئی امکان تھا، اور نہ آئندہ کوئی مسلمان اس کی جرأت کر سکتا ہے،

مستشرقین کا مخالفانہ طرز عمل

مستشرقی فکر جس مذہبی پیچیدگی کا شکار ہے، اس میں مزید اضافہ اس طرح ہوا کہ وہ اسلام اور پیغمبر اسلام کی مخالف قوتوں کا ہر موقع پر ساتھ دیتے ہوئے نظر آتے ہیں، اس کی وجہ سے غیر جانب داری کے ساتھ صحیح فیصلہ تک پہنچنا ان کے لیے ممکن نہیں رہتا، مارگولیتھ ولہاسن اور بروکلمان کے یہاں اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں، مثلاً بروکلمان کہتا ہے، کہ

"کچھ ہی مدت کے بعد محمد صلعم اور علمائے یہود کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے، ان کے پاس اگرچہ اس دور دراز علاقہ میں زیادہ علم نہیں تھا، تاہم وہ رسمی علوم اور ذکاوت میں نبی امی سے بڑھکر تھے، [3]

[2] ڈاکٹر محمد البہی۔ الفکر الاسلامی الحدیث ص ۵۹۳ - ۶۰۱ [3] کارل بروکلمان تاریخ الشعوب الاسلامیہ میں، ص ۴۷ ترجمہ فارس اور بعلبکی طبع پنجم دار العلم للملایین بیروت ۱۹۶۵ء

احد میں محمدؐ کی فوجی مہارت پر ضرب پڑنے کی وجہ سے جو نقصان ہوا اس کی تلافی کے لیے دوسرا راستہ اختیار کرنا ضروری تھا، چنانچہ انھوں نے یہودیوں کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا، اور ایک معمولی سبب کی وجہ سے بنو نضیر پر حملہ کر دیا۔[1]

ولہاسن نے بھی یہی بات لکھی ہے کہ

غزوۂ بدر کے بعد اسلام نے رواداری ترک کر دی، اور مدینہ میں اپنی دہشت پسندی کا آغاز کر دیا، منافقوں کا مسئلہ، سیاست میں ایک نئے موڑ کی علامت تھا، یہود کے بارے میں یہ تاثر دیا گیا کہ انھوں نے عہد شکنی کی ہے، اور چند ہی سالوں میں مدینہ کے گرد و پیش مختلف بستیوں میں آباد یہودی گروہوں کو جلا وطن کر دیا گیا یا ان کو ختم کر دیا گیا، حالانکہ وہ عربی قبائل کی طرح وہاں یکجا آباد تھے، مگر ان کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے معمولی اسباب ہی کو کافی سمجھ لیا گیا۔[2]

مارگولیتھ بھی یہودیوں پر مہربان ہے وہ یہ سمجھتا ہے، کہ خیبر کے یہودیوں پر حملہ ظالمانہ کارروائی تھی، اور اس کو کسی طرح جائز نہیں کہا جا سکتا، اس کا بیان یہ ہے کہ محمدؐ نے ہجرت کے بعد چھ سال غارت گری میں صرف کئے، مکہ پر غارت گری کا جواز تو یہ ہے کہ وہ ان کا وطن اور جائے پیدائش تھا، وہاں ان کی املاک کو برباد کیا گیا، اور ان کو وہاں سے نکال دیا گیا۔ مدینہ کے یہودی قبائل کا بھی یہی معاملہ تھا کہ حقیقی یا فرضی اسباب کی وجہ سے ان سے انتقام لیا گیا، مگر خیبر مدینہ سے کافی فاصلہ پر تھا، انھوں نے محمدؐ یا مسلمانوں کے ساتھ کوئی ایسی بات نہیں کی جس کو ان سب کی طرف سے زیادتی تصور کیا جائے، ان میں سے کسی ایک کا محمدؐ کے بھیجے ہوئے قاصد کو قتل کر دینا، ان سب کے حق میں انتقامی کارروائی کو جائز قرار دینے کیلئے

[1] کارل بروکلمان: تاریخ الشعوب الاسلامیہ ص ۴۰ ترجمہ فارس اور بعلبکی طبع پنجم دار العلم للملایین قاہرہ ۱۹۶۸ء ص ۳۲

[2] ولہاسن: الدولۃ العربیۃ و سقوطہا ص ۱۵-۱۰ ترجمہ محمد عبد الہادی قاہرہ ۱۹۶۸ء

کافی نہیں ہے، یہ کارروائی محمدؐ کی سیاست میں بڑی تبدیلی کی نشاندہی کرتی ہے، مدینہ میں تو شروع میں انھوں نے یہود کے ساتھ مسلمانوں کی طرح برتاؤ کرنے کا اعلان کیا۔ مگر چند سال بعد ان کا طرزِ عمل بالکل ہی تبدیل ہو گیا۔ اب کسی گروہ پر حملہ آور ہونے کے لیے صرف یہ بات کافی تھی کہ وہ غیر مسلم ہے، مسلسل حملہ آور ہونے کے بارہ میں محمدؐ کے جذبات وہی ہو گئے تھے، جو ہم ان سے پہلے سکندر یونانی میں یا ان کے بعد نپولین میں دیکھتے ہیں، خیبر پر محمدؐ کے قبضہ سے یہ بات واضح ہو گئی کہ پوری دنیا کے لیے اسلام کس حد تک خطرہ بن چکا تھا۔[1]

مستشرقین اسلام کے خلاف بت پرست عربوں کے لیے مہربانی اور شفقت کے جذبات رکھتے ہیں، حالانکہ بت پرستی اول و آخر رجعت پسندی کی علامت بن گئی تھی، مگر مستشرقین کا رویہ دیکھ کر ہمیں یہ سوچنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے، کہ وہ اپنے اسلاف یعنی یہود خیبر کے نقش قدم پر چلے ہوئے ہیں، انھوں نے قریش کے لیڈروں کے ساتھ مل کر یہ حلفیہ بیان دیا تھا کہ دین محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مقابلہ میں بت پرستوں کا مذہب بہتر ہے، اور وہی حق پر ہیں،[2]

یقیناً یہود خیبر کا موقف اور مستشرقین کا طرزِ عمل دونوں یکساں اور واضح ہیں،

بروکلمان کی رائے یہ ہے کہ

"مشرکین پر براہ راست اور مسلسل حملوں کا آغاز کرنے میں رسولؐ کے سامنے حالات نے چند رکاوٹیں کھڑی کر دیں، قریش کا قدیم نسبی شرف مہاجرین کو ان پر حملہ آور ہونے سے روکے ہوئے تھا، اور مدنی باشندوں کو اپنے طاقتور پڑوسیوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے میں بدامنی اور انتشار کا خطرہ تھا، اس لیے ان کو بھی قریش سے

[1] محمد اینڈ دی رائز آف اسلام ص ۳۰۳-۲۶۲ [2] ابن ہشام ۱: تہذیب ص ۲۰۱ الواقدی: المغازی ص ۲۴۲-۲۴۱ تحقیق مارسڈن جونس آکسفرڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۶۶ء

جنگ کرنے میں زیادہ دلچسپی نہ تھی، مگر رجب کا محترم مہینہ آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خفیہ طور پر ہدایات دیکر غازیوں کا ایک دستہ تجارتی قافلہ کو اچانک لوٹ لینے کے لیے روانہ کیا جو فوجی دستہ اس قافلہ کے تحفظ کے لیے ساتھ تھا، وہ اس ماہ کی حرمت کی وجہ سے مطمئن ہو کر آگے بڑھ گیا تھا، چنانچہ غازیوں کو بہت زیادہ مال غنیمت ہاتھ آیا۔ اور وہ اس کو لے کر مدینہ آئے قبائلی اخلاقی قانون کی اس خلاف ورزی پر مدینہ میں جب مخالفت کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا تو اگرچہ مذکورہ کارروائی محمدؐ کی خواہش پر ہوئی تھی، مگر انھوں نے اپنے پیرووں کی کارگزاری پر نکیر کی اور یہ تاثر دیا کہ انھوں نے ہدایات کا مفہوم اچھی طرح نہیں سمجھا تھا۔[1]

نولدکی یہ تمنا کرتا ہے کہ کاش عرب قبائل اپنی روایات و رسوم اور اپنی آزادی کی طرف سے دفاع کرنے کے لیے محمدؐ کے خلاف آپس میں کوئی اہم معاہدہ کر لیتے تو ان کے خلاف محمدؐ کا جہاد بے اثر ہو جاتا مگر مختلف قبیلوں کو یکجا اور متحد کرنے میں کسی بھی عرب کی ناکامی کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان تمام قبیلوں کو ایک ایک کر کے شکست دینے اور خود فتحیاب ہونے کا موقع مل گیا، کہیں طاقت کے بل پر اور کہیں دوستی اور امن کے معاہدوں کے ذریعہ۔[2]

چند مستشرقین نے تاریخ اسلام کے بعض مخفی گوشوں کو واضح کیا ہے، مگر چونکہ ان کا تحقیقی پس منظر صحیح نہ تھا، اس لئے ان کے تحقیقی انکشافات لغزشوں، کوتاہیوں اور غلطیوں کے انبار میں دب گئے ہیں مگر تمام مستشرقین یکساں نہیں ہیں، ان میں ایک تعداد ان لوگوں کی بھی ہے، جنھوں نے حق اور انصاف کی خاطر اپنی آواز بلند کی ہے، اپنے ہم پیشہ مستشرقین کا بہتر انداز میں تنقیدی جائزہ لیا، اور ان کی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے، جیسا کہ ہم نے

---

[1] تاریخ الشعوب الاسلامیہ ص ۴۴ [2] تاریخ العالم للمؤرخین ج ۸ ص ۱۱

ڈینیٹ، واٹ، درمنگھم اور آرنلڈ کے مختلف اقتباسات میں اس کی مثالیں پیش کی ہیں، مگر اس کے باوجود ان کے نقطۂ نظر کو ہم پورے طور پر پاکیزہ علمی اسلوب کا نمونہ قرار نہیں دے سکتے اور ان کے لیے یہ بات ممکن بھی نہیں ہے،

ایک اور نقطۂ نظر

موجودہ صدی کی ابتدا اور روس میں کمیونسٹ انقلاب کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلامی تاریخ کے بارہ میں ایک نیا نقطۂ نظر پیدا ہوا، سیرت کے واقعات کو تاریخ کی مادی تعبیر اور اس کے اصولوں کا تابع بنا دیا گیا، حالات اور واقعات ان اصولوں کے مطابق ہوئے تو ان کو قبول کر لیا گیا، اور جو واقعات متصادم معلوم ہوئے، ان کو نظر انداز کرنے یا رد کرنے کی کوشش کی گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ جن پہلوؤں یا واقعات کو چھوڑ دیا گیا ہے، وہ قابل قبول حصہ کے مقابلہ میں ۹/۱۰ سے زیادہ ہیں، واقعات سیرت کی توجیہ و تاویل اور ان کی اپنے اصولوں کے مطابق تشریح کرنے میں اگر ناکامی ہوئی تو انھوں نے قطع و برید سے کام لیا، اور دور از کار تاویلات کے ذریعہ اپنی مطلب برآری کی کوشش کی، اپنے فلسفہ اور اصل واقعات کے درمیان تطبیق دینے کے لیے، انھوں نے یک طرفہ انداز میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ان میں وہ ایک دوسرے سے بھی قطعی مختلف ہیں حالانکہ سب ایک ہی مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں، اور تاریخ کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر یکساں ہونے کی غالباً وجہ یہ ہے کہ جدلیاتی فلسفہ پر ایمان کی وجہ سے ان میں ہر شخص دوسرے کے برعکس رائے رکھتا ہے، وہ ایک دوسرے سے اختلاف و جدال کے بعد شاید متوقع اتحاد اور موہوم یکسانیت کی طرف رواں دواں ہیں، بہرحال اس موقع پر ہم بطور مثال سیرت رسولؐ کے بارہ میں ان کے چند اقوال پیش کر رہے ہیں۔

روسی استشراق کے کچھ نمایندوں کی رائے یہ ہے کہ مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ میں عربوں نے ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کا ابتدائی منظر دیکھا جو غلامی کا قائل تھا، بیجل فسکائی کے خیال میں

قرآن مجید کو اس بات کا شعور ہے کہ غلامی کے رواج کو ایک مرحلہ میں قائم رکھا جائے مگر بجلی نکائی
آگے جاکر، بلائیف کی اس بات سے متفق ہو جاتا ہے، کہ عربوں میں جاگیرداری کا دور، دوسری
قوموں سے ان کے روابط کا نتیجہ ہے، مگر بعض روسی اہل قلم یہ لکھتے ہیں کہ عملی طور پر اسی زمانہ میں
جاگیردارانہ معاشرہ کی تشکیل ہونی شروع ہوئی، یہ اہل قلم اپنے خیال کی وضاحت کرتے ہوئے،
انتشار کا شکار ہو جاتے ہیں، ان میں سے ایک طبقہ جس میں کلائی مودیگ بھی شامل ہے یہ سمجھتا ہے
کہ اسلام ملکیت اور جاگیردارانہ تعیش کے ذریعہ جدید استحصال کرنے والوں کے لیے سازگار
ہے، ایک طبقہ کا یہ خیال ہے کہ یہ سازگاری صرف غلامی سے انتفاع کی حد تک ہے، لیکن
بلائیف وغیرہ کی رائے یہ ہے کہ چونکہ قرآنی اسلام، حکمراں طبقوں کے سیاسی اور اجتماعی مفادات
کے لیے سازگار نہیں ہے، اس لئے جدید طبقاتی استحصال کو گوارا بنانے کے لیے مسلمانوں کو
وضع حدیث کا سہارا لینا پڑا، روسی مستشرقین کے ایک طبقہ کے نزدیک تعیش پسندی نے
اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے عرب قبیلوں کو متحد کر دیا تھا، جب کہ ایک دوسرے طبقہ کا خیال
یہ ہے کہ عربی قبائل اتحاد کے لئے جست لگانے ہی والے تھے کہ اسلام نے آکر ان کی امنگوں
کو پورا کیا، اور ان کو متحد کر دیا تاریخ عالم میں زمانۂ اسلام کا ذکر آتے ہی روس کے ان مستشرقین کا
رویہ پراگندہ ہو جاتا ہے، کلائی مونگ کا دعویٰ ہے کہ محمد ؐ ان چند نبیوں میں ہیں، جنھوں نے
توحید کی خوش خبری دی، اس توحید سے ان کا مقصد قبیلوں میں اتحاد پیدا کرنا تھا، دوسری طرف
طاس توف، نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود کی نفی کرتا اور آپ کو ایک خیالی شخصیت قرار
دیتا ہے، دوسرے اہل قلم ظہور اسلام کے واقعہ کو تسلیم کرتے ہیں، مگر کلائی مونگ کا دعویٰ یہ ہے
کہ اسلامی شریعت کا بڑا حصہ بعد میں اور جاگیرداروں کے مفاد میں وجود پذیر ہوا ہے اس کے
نزدیک محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزانہ فتوحات کی وجہ سے اصول اسلام کی ترتیب عمل میں

آئی ہے، ٹاس نوف کا کہنا یہ ہے کہ حکمران طبقہ کو فائدہ پہنچانے کے لیے دورِ خلافت میں جو
خیالی افسانے گھڑ لیے گئے تھے، انھیں کے تانے بانے سے اسلام کی نشو و نما ہوئی یہ خیالی افسانے
گذشتہ عقیدوں سے ماخوذ تھے، جن کو حنفیت کا نام دیا جاتا تھا۔[1]
روسی استشراق کے مذکورۂ بالا نمونے پڑھکر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بھی ایک نیا مذہب
ہے، جو اسلام اور پیغمبر اسلام ؐ سے اپنی نفرت اور واقعات کا تجزیہ کرتے ہوئے اصول تحقیق سے
روگردانی میں نصرانیت سے کسی طرح کم نہیں، تاریخ اسلام اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
کے بارے میں ان جدید راہبوں نے دراصل صرف اپنا چولا تبدیل کیا ہے، ورنہ وہ جدید مادی
پناہ گاہوں میں بھی اسی فکر و نظر کے حامل ہیں، جس نے نصرانیت کو تاریکیوں میں ڈھکیل
دیا تھا، اس نئے مادی کلیسا کا ایک فرزند بندلی جوزی ہے۔[2] وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
کے طرزِ عمل کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

> مدینہ میں پہنچ کر اہل مکہ کے ساتھ نبی ؐ کے طرزِ عمل میں بڑی تبدیلی آگئی یہاں
> بدلے ہوئے ماحول نے نئے حالات و اسباب پیدا کر دیئے تھے، وہ اثر انداز ہوئے
> نبی کی اپنے وطن اصلی سے محبت، اس کے باشندوں سے پیار اور نئے سیاسی
> محرکات اور نفسیاتی عوامل جن کا بدر و اُحد اور مدینہ کے محاصرہ کے بعد اظہار ہوا ہے،

---

[1] عبد العزیز دوری وغیرہ: تفسیر التاریخ ص ۱۴-۱۶، مکتبہ النہضہ بغداد۔ [2] بندلی جوزی (۱۸۷۱-۱۹۴۲ء) قدس کا باشندہ اور عیسائی ہے، اس نے سامی زبانوں اور مشرقی علوم میں قازان (روس) سے ڈگری لی، مسیحی راہبوں کے ایک ادارہ معہد الرہبان میں اور پھر قازان یونیورسٹی اور بعد ازیں باکو یونیورسٹی میں اپنی وفات تک تدریسی خدمات انجام دیں، عام روسی مستشرقین اپنی تحقیقات میں اس کو اپنا ماخذ تسلیم کرتے ہیں۔ دیکھئے نجیب عقیقی کی کتاب المستشرقون ج ۲ ص ۹۳۱ - مطبع دار المعارف القاہرہ ۱۹۶۴ء

ان ہی کا یہ اثر تھا کہ نبیؐ نے اپنے مکی بھائیوں کے ساتھ نرمی کی سیاست اپنائی، دوسری طرف مکہ کے اصحاب اقتدار نے بھی معرکۂ بدر اور اپنے تجارتی نقصانات کی وجہ سے یہ طے کیا کہ کعبہ، حج اور عکاظ کے تحفظ اور ان کے بارہ میں قبل اسلام کی روایتوں کو باقی رکھنے کی شرط پر بہت سے معاملات میں نبیؐ کے ساتھ نرمی اور درگذر کا رویہ اختیار کریں، اس طرح وہ متوقع تھے کہ نبیؐ بھی ان کے ساتھ درگذر کا معاملہ کریں گے اور ان کو اپنے جدید منصوبوں کے فوائد میں شریک کرلیں گے، غالباً مفاہمت کی شرطوں میں یہ بات بھی رہی ہو،[1] کہ نبی مدینہ میں قیام کریں گے اور ان کے مالی امور میں چھیڑ چھاڑ نہیں کریں گے، اسی وجہ سے حدیبیہ میں صلح ہوئی، دلداری کی سیاست اپنائی گئی، یا دوسروں لفظوں میں یہ کہنا چاہئے کہ عفو و درگذر اور نرمی کی سیاست لین دین یا باہمی مفاہمت کا نتیجہ تھی، چنانچہ لوگ دین اسلام میں فوج در فوج داخل ہوتے چلے گئے، اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ دین جدید کی صحت پر یقین رکھتے تھے، جس کے بارہ میں ان کی معلومات معمولی تھیں، وہ اقتدار کے جدید نمایندوں سے تقرب حاصل کرنے، اپنے قدیم مرکز کی حفاظت کرنے اور اپنی کئی کئی نسلوں کی جمع پونجی کو بچانے کے لیے دین جدید کے قریب آئے تھے، میرا گمان یہ ہے، کہ حدیبیہ میں یا کسی دوسرے وقت اور کسی اور جگہ، طرفین میں جن شرطوں پر اتفاق ہوا تھا، ان میں یہ بات بھی تھی کہ محمدؐ سردارانِ مکہ پر معترض نہ ہوں گے ورنہ مرکز حجاز کے غلام اور فقراء ان کے خلاف جنگ چھیڑنے پر آمادہ کردیں گے۔

۱؎ یہ کس مفاہمت کا ذکر ہے؟ یہ کس جگہ اور کب ہوئی؟ کس تاریخی روایت میں اس کا ذکر کیا گیا ہے! یا کس ماخذ سے اس کا علم ہوا ہے؟

میرے خیال میں مدنی سورتوں اور خصوصاً دورِ آخر میں نازل ہونے والی آیتوں میں اہل مکہ پر اعتراضات یا ان کے بارہ میں سخت آیتوں کی عدم موجودگی کی بڑی وجہ یہی ہے،[1] اس کے علاوہ ایک اور اہم وجہ یہ ہے کہ مدینہ میں نبی کے اجتماعی حالات نمایاں طور پر بدل چکے تھے، جن کی وجہ سے نبی کے مزاج و طبیعت میں تبدیلی آگئی تھی، اس تبدیلی اور بعض ان اسباب کی وجہ سے جن میں سے چند کا ہم نے ذکر کیا اور کچھ کا ہم نے تذکرہ نہیں کیا ہے (؟) یہ نتیجہ نکلا کہ نبیؐ کی بعض اجتماعی اور دینی اصلاحات ناقص رہ گئیں، اور ان میں وہ بات پیدا ہوگئی، جس کو اہل یورپ مداہنت یا ڈھیلا پن قرار دیتے ہیں۔[2]

بندلی جوزی یہ بھی لکھتا ہے، کہ مکی دور تمہید اور تیاری کا دور تھا، قوم کے تمام طبقوں میں نئی دعوت کی نشر و اشاعت کا دور، ایک ایسا زمانہ جس میں اپنے عقیدہ پر ثابت قدم اور اپنے عمل میں مخلص ایک شخص ان لوگوں سے برسرِ پیکار، اور کلامی نزاعات میں الجھا ہوا تھا، جنھوں نے اپنی دولت اور ملک میں اپنی قیادت کے لیے خطرہ کی بو سونگھ لی تھی، چنانچہ ان لوگوں نے مقاومت اور مقابلہ کا فیصلہ کرلیا، یہ تگ و دو اور ایسی تمناؤں کا زمانہ تھا، کہ اگر وہ ہر طرح پوری ہوجاتیں، تو ملک میں ایک کامل انقلاب رونما ہوجاتا، کتنا

۱؎ علمی تحقیق کے بنیادی تقاضوں سے روگردانی اور تاریخ کے تسلیم شدہ واقعات کے ساتھ کھلواڑ کی یہ بدترین مثال ہے، ورنہ بندلی جوزی کو یہ بتانا چاہئے تھا، کہ مذکورۂ بالا شرطیں کب اور کہاں طے ہوئیں، حالانکہ صلح حدیبیہ کی شرطیں اپنے اصل لفظوں کے ساتھ، تمام مصادر و ماخذ میں موجود ہیں، مؤلف کی بیان کردہ شرطیں کہاں درج کی گئی ہیں؟ ۲؎ تاریخ الحرکات الفکریہ فی الاسلام۔ ص ۴۹-۵۰۔

خوبصورت اور عظیم تھا وہ زمانہ اور کس قدر شیریں تھے وہ خواب اور کس قدر خوشگوار تھی وہ جدوجہد جو ان خوابوں کی تکمیل میں صرف ہوئی، دوسرا دور عمل اور تنظیم کا اور جنگ آزمائی کا دور تھا، یہ سیاست اور حقیقت پسندی کا زمانہ تھا، جس میں طرفین نے نرمی اور مداہنت کا رویہ اپنایا، اور ایسے اجتماعی انقلابات میں مداہنت کا مطلب یہ ہے کہ کچھ اغراض وعقائد سے دست برداری یا ان کے مطالبہ میں نرمی برتی جائے، کچھ خیالات سے رجوع کیا جائے یا ان کے لیے ایسا موقع ومحل متعین کر دیا جائے جس سے دونوں فریق مطمئن ہوں، چونکہ مکہ کی جمہوریہ کے صدر ابوسفیان سرداران مکہ کے نمائندے اور ایک تجربہ کار اور باخبر فرد تھے، اس لیے ان کے اور نبی عربیؐ کے درمیان مذکورہ بالا طریقہ پر مفاہمت ہو گئی تھی، وہ نبی کی روحانی اور عالمی سیادت کو تسلیم کر لیتے، اور بت پرستی کو چھوڑ دیتے ہیں، نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں، اور نبیؐ یہ عہد کرتے ہیں کہ مکہ عرب کے دینی مرکز کی حیثیت سے برقرار رہے گا، مکہ کے سرداروں اور اس کے فکری رہنماؤں کو سلطنت یا جدید روحانی جمہوریہ کے انتظامی امور میں حصہ دیا جائے گا اور ان کو اپنی مرضی کے مطابق گذربسر اور کاروبار کی آزادی حاصل رہے گی، ایک تیسرا فریق غریبوں اور محتاجوں کا تھا، اور در اصل ان ہی کے لیے جنگ بھڑکی تھی، اور ان ہی کے حالات کو بہتر بنانے کے لئے دعوت اسلامی کا آغاز ہوا تھا، ابتدا میں ان کو کچھ تو زکوٰۃ وصدقات کے ذریعہ راضی کر لیا گیا اور پھر نبیؐ کی وفات اور ان کے خلفاء کی رحلت کے بعد لوگ فقراء کے حق کو بھول گئے اور یا پھر اس حق کو نظر انداز کر دیا گیا، چنانچہ ان فقراء کی حالت وہی ہو گئی جو پہلے تھی، بلکہ اس سے بھی زیادہ بدتر صورت حال پیدا ہو گئی۔[1]

۱؎ تاریخ الحرکات الفکریۃ فی الاسلام ص ۵۰، ۵۱-۵۲۔

یہی بندلی جوزی ایک اور جگہ کہتا ہے کہ

یہ ایک واقعہ ہے کہ نبی عربیؐ نے مکہ اور مدینہ میں اپنے اقوال واعمال کے ذریعہ کبھی بھی بدی کے اجتماعی اسباب اور اس کے تمام جراثیم کی بیخ کنی کا ارادہ نہیں کیا جب کہ آج کمیونسٹ پارٹیاں اپنے ناموں اور رجحانات میں فرق کے باوجود یہی کام انجام دے رہی ہیں، نبی عربیؐ کا بڑا مقصد یہ تھا کہ بعض طبقوں کی ان مصیبتوں میں کسی قدر کمی کر دیں جنھوں نے تقسیم رزق کے بعد جنم لیا ہے، یا حالات کا مقابلہ نہ کر پانے کی وجہ سے وہ غلامی اور فقر میں مبتلا ہو گئے ہیں، نبی عربیؐ تمام اجتماعی بیماریوں کے جراثیم کا خاتمہ کرنا چاہتے تو جزیرۃ العرب میں صاحب اقتدار ہونے کے بعد مذکورہ طریقوں کے علاوہ وہ دوسرے وسائل سے بھی کام لیتے۔

گذشتہ تمام نبیوںؑ کی طرح نبی عربیؐ نے بھی چند نادر موقعوں کے سوا تمام حالات میں ادبی وسائل کے اختیار کرنے کو ترجیح دی، ان طریقوں کو نہیں جن کے اختیار کرنے پر ہمارے زمانے میں یورپ کے مصلحین اور ماہرین سیاست لینن اور مسولینی وغیرہ مجبور ہوئے ہیں، اسی وجہ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ محمدؐ نے عربوں کے اجتماعی امراض کی تشریح اور ان کی تعداد کے بیان کرنے میں زیادہ بہتر کارکردگی کا ثبوت دیا ہے، ان کے علاج اور جراثیم کی بیخ کنی کے معاملہ میں یہ ثبوت نہیں دیا۔[1]

بندلی جوزی کے علاوہ مستشرقین کی ایک بڑی تعداد بھی ان ہی خیالات کی علمبردار ہے ان کے بہت سے شاگرد مشرقی ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں، اور ان کے فکر وفلسفہ کی بنیاد پر مختلف مکاتب فکر قائم ہیں، مگر سرزمین اسلام سے ناواقفیت اور تحقیق کے سچے اصولوں سے بے گانگی

۱؎ تاریخ الحرکات الفکریۃ فی الاسلام ص ۴۴-۴۵۔

ان کا مشترک سرمایہ ہے، یہی وجہ ہے کہ کلیسا کی پر فریب تحقیقات، تاریخی مادیت یا سیکولرزم پر مبنی استشراق کو زیادہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی، ان کی تحقیقات کا مسلمانوں پر بھی زیادہ اثر نہیں ہوا، چنانچہ استشراق کو اپنے قدیم رنگ و آہنگ کے نقصانات کا اندازہ ہو چکا ہے، اب وہ اپنی تحقیقی بحثوں میں اعتدال اور معروضیت کا مظاہرہ کرنے پر مجبور ہوئے ہیں، اور منٹگمری واٹ اسی طبقہ کی نمائندگی کرتا ہے،

منٹگمری واٹ کا طرز تحقیق منٹگمری واٹ دوسرے مستشرقین کے مقابلہ میں اصول تحقیق کے معیار کو قائم رکھنے میں ممتاز نظر آتا ہے، اس کو تحقیق کے لازمی تقاضوں کا شعور حاصل ہے، اور اس نے تنقیدی موازنہ کا بہتر اور پسندیدہ اسلوب اختیار کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ سیرت کے باب میں اس نے اپنی تحقیق کے ذریعہ کئی قابل قدر چیزیں پیش کی ہیں، لیکن اپنے پیشرو اور معاصر مستشرقین کی طرح وہ اکثر اپنے تنقیدی ذوق کی طرف واپس ہو جاتا ہے، اور سیرت پاک کی مسلّم حقیقتوں سے بہت بڑی حد تک انکار کر بیٹھتا ہے،

منٹگمری واٹ نے یہ دعوی کیا ہے کہ وہ اپنی تحقیق میں معروضیت کا پابند رہے گا، لیکن وہ مخالفانہ جذبات کے دباؤ سے آزاد نہیں رہ سکا۔ اس نے بار بار اصول تحقیق سے انحراف کیا ہے، تاریخ میں گروہ بندی کے اس دور میں اس کے حق میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ وہ کئی اعتبار سے دوسروں پر فائق ہے، اس کے یہاں دوسرے مستشرقین کے برعکس زیادہ معروضیت پائی جاتی ہے، وہ تاریخی واقعات کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا ہے، پیشگی مفروضوں کا سہارا نہیں لیتا ہے، وہ واقعات کے تانے بانے ہی سے اپنے لیے نظریں تلاش کرتا ہے، اور ان سے نتائج اخذ کرتا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ اس کے بارے میں ہمارا حسن ظن زیادہ دیر تک باقی رہ گیا ہو، وہ واقعات کی زبان حال سے ایسی باتیں لکھ جاتا ہے جو زمانہ کی

علمی روش اور اس دور کے وسیع اور عمیق مزاج سے کوئی مناسبت نہیں رکھتیں، واٹ نے تاریخی عصریت کے حوالہ سے جن خیالات کو درج کتاب کیا ہے، ان سے اس زمانہ کی تسلیم شدہ اور بدیہی حقیقتیں بھی اپنی جگہ قائم نہیں رہتی ہیں، ہم اس بارہ میں اپنے ذاتی رجحانات یا کسی پیشگی فیصلہ سے بچنے کے لیے یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ واٹ کے تحقیقی نتائج کا مطالعہ کریں اور یہ دیکھیں کہ سیرت کے میدان میں مستشرقین کی اکثریت نے جو اصولی غلطیاں کی ہیں وہ واٹ کی تحریروں میں کس حد تک پائی جاتی ہیں، ہم واقعات کی جزئیات اور تفصیلات پر رد و مناقشہ کے بجائے معروضیت اور اصول تحقیق سے واٹ کے انحراف کی نشاندہی کریں گے اس لیے کہ یہاں ہمارا موضوع سیرت کے حقائق[1] کے بجائے وہ طرز عمل ہے جو سیرت کے بارے میں مستشرقین نے اختیار کر رکھا ہے۔

واٹ کی کتاب "محمد ایٹ مکہ" میں اصول تحقیق کی دو غلطیاں نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ محض ذوق تنقید سے کام لیکر مختلف روایتوں کو رد کر دیا گیا ہے، یا ان کی صحت کو مشکوک قرار دینے کی کوشش کی گئی ہے، اور دوسری غلطی یہ ہے کہ ماضی کے تاریخی واقعات پر آج کے نسل و نسب پر مبنی تخیلات اور معاصرانہ نقطۂ نظر کی روشنی میں غور کیا گیا ہے، اس بارہ میں واقعات کے پس پردہ اسباب کی کھوج لگانے اور ان میں باہمی وحدت کی جستجو کے لیے منطق کے وضعی اصولوں پر اعتماد ہی کو سب کچھ سمجھ لیا گیا ہے۔

واٹ کی اس کتاب میں اور بھی قابل گرفت باتیں ہیں، جن کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ واقعات سیرت کا ایک حصہ یہودیت یا مسیحیت کے قدیم مذہبی مصادر سے ماخوذ ہے،

---

[1] حقائق سیرت کے بارے میں تفصیلی بحثوں کے لئے دیکھئے دراسۃ فی السیرۃ مولفہ عماد الدین خلیل طبع پنجم موسسۃ الرسالۃ بیروت ۱۹۸۱ء

واٹ کی تحقیق کا پہلا نقص بہر حال اب ہم تحقیقی مباحث میں واٹ کی لغزشوں اور کوتاہیوں کا جائزہ لیں گے، اس کی پہلی غلطی یہ ہے: تنقید میں غلو، اپنے مخصوص ذوق اور رجحان طبع کی وجہ سے روایتوں کا انکار، شبہات کی تخم ریزی اور ضعیف اور شاذ روایتوں پر اعتماد،

بحیرا راہب اور شق صدر کا واقعہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اور حضرت خدیجہؓ سے آپ کے نکاح کے درمیانی عرصہ میں جو اہم واقعات رونما ہوئے واٹ نے ان کا جائزہ لیا ہے، اور پھر لکھتا ہے کہ :-

یہ واقعات، نکاح سے پہلے محمدؐ کی زندگی پر اثر انداز ہوئے ہیں، ایک مؤرخ کے نقطۂ نظر سے ان میں سے چند واقعات بحث طلب ہیں، ان کے ساتھ بڑی تعداد میں ایسی روایات بھی ہیں، جن کو فقہی نوعیت کی روایتیں کہا جا سکتا ہے۔ لیکن ایک مورخ کے نزدیک وہ صداقت پر مبنی نہیں ہیں ان میں جو واقعات ہیں ان کو محمدؐ کی زندگی کے مختلف ادوار کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے، البتہ اپنے مفہوم کے اعتبار سے ایمان دار مسلمانوں کے لیے یہ روایات محمدؐ کے مقصد کو پورا کرتی ہیں، اور اس طرح وہ برمحل کہی جا سکتی ہیں، وہ ان کے نبیؐ کی زندگی کے شایان شان ایک ضمیمہ ہو سکتی ہیں، وہ نگاہ عقیدت کی پیدا کردہ ہیں ورنہ ان واقعات کے دوسرے شواہد بھی موجود ہوتے بہر حال ہم یہاں ابن اسحاق کی روایت کے مطابق وہی واقعات ذکر کریں گے جو زیادہ مشہور ہیں۔[1]

واٹ نے ابن اسحاق کی روایت کے مطابق دو فرشتوں اور بحیرا راہب کے واقعہ کا ذکر کیا ہے، اور پھر یہ تنقید کرتا ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اور

---

۱ محمد ایٹ مکہ ص ۷۲ عربی ترجمہ از شعبان برکات مطبوعہ المکتبۃ العصریۃ بیروت۔

نکاح کے درمیان ۲۵ سال کے عرصہ میں جو واقعات پیش آئے ہیں، ان کے زمانہ وقوع کے بارے میں ایک عام قاری تذبذب اور پریشانی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اگر بحیرا راہب کا واقعہ بحث طلب ہے، اور تنقید کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا ہو[1] تو شق صدر کے واقعہ کا انکار بھی دشوار ہے، صرف اس لیے نہیں کہ ابن ہشام[2]، ابن سعد[3] اور بلاذری[4]، اور دوسرے ابتدائی مورخوں کے علاوہ اس کی روایتیں صحیح مسلم[5] اور مسند احمد[6] میں بھی موجود ہیں، بلکہ اس واقعہ کا انکار اس لیے بھی دشوار ہے کہ یہ واقعہ غیبی سرچشمہ رکھنے والے نبی کی شخصیت سے براہ راست تعلق رکھتا ہے، جس کے بعد اب نبیؐ کی ذات تاریخ کے آئینہ میں عقلی تجزیہ کے دائرہ سے بالاتر ہو جاتی ہے، یہاں نبی کی زندگی میں غیب اور شہود دونوں ایک ہو جاتے ہیں، اس لیے اب دو ہی راستے رہ جاتے ہیں، یا تو ہم اس وصف کا اعتراف کر لیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک نبی کی حیثیت دیتا اور نفسیاتی نشو و نما کے وسائل پر نبوت کے اثرات ڈالتا ہے، اور یا سرے سے اس وصف کا انکار کر کے وحی کو ایک تجرباتی چیز قرار دیں، لیکن اگر وحی انسان کا کوئی اختیاری تجربہ نہیں ہے، تو پھر یقیناً اس کا رشتہ ان روایات کے ساتھ سمجھ میں آجائے گا، جو فقہی نوعیت کی ہیں، اور جو ایک مورخ کی نظر میں حقیقی نہ ہوں تاہم مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے وہ صداقت پر مبنی ایک واقعہ ہیں،

---

۱ دراسۃ فی السیرۃ ص ۷۰-۷۱، ۲ تہذیب سیرت ابن ہشام۔ ص ۳۲-۳۱ عبد السلام ہارون۔ طبع دوم، موسسۃ عربیہ حدیثہ، قاہرہ ۱۹۶۴ء۔ ۳ طبقات کبیر لابن سعد ص ۱/۱، ۷۰، ۷۴، تحقیق ایڈورڈ سخو مطبوعہ عکسی از نسخہ بریل ۱۹۲۴ء۔ ۴ انساب الاشراف للبلاذری ج ۱ ص ۸۱، ۹۲ تحقیق ڈاکٹر محمد حمید اللہ معہد المخطوطات لجامعۃ الدول العربیۃ، دار المعارف، قاہرہ ۱۹۵۹ء
۵ صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۰۲-۱۰۱ ۶ مسند احمد ج ۳ ص ۱۲۱۔

حضرت خدیجہؓ کی عمر | ایک تاریخی واقعہ کو اس کی حقیقی شکل میں نہ دیکھنے کا یہی نتیجہ ہو سکتا ہے، کہ سرے سے اس کی تاریخی حقیقت ہی کا انکار کر دیا جائے، چنانچہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کیا اور آپ کی بیوی حضرت خدیجہؓ سے سات بچے ہوئے اس پر بھی واٹ اپنے مفروضہ کو بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

"اگر حضرت خدیجہؓ سے ہر سال ایک بچہ کی پیدائش ہوئی تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آخری بچہ کی ولادت کے وقت وہ اڑتالیسؓ برس کی ہو گئی تھیں، یہ بات ناممکن تو نہیں ہے، مگر ایسی حیرت انگیز بات ہے، جس پر رائے زنی کی جائے یہ ایسی قابل قبول بات ہی، جسے بعد میں معجزہ قرار دیا جاسکتا ہے"[1]

مذکورہ بالا مسئلہ میں پیچیدگی کی کوئی بات نہیں ہے، اگرچہ حضرت خدیجہؓ اپنے نکاح کے وقت چالیس برس سے کچھ کم رہی ہوں یا چالیس برس کی ہو چکی ہوں کیونکہ پچاس برس کی عمر تک صلاحیت تولید کا پایا جانا ناممکن نہیں ہے، لیکن واٹ نے اس مسئلہ پر جو موقف اختیار کیا ہے، وہ یہ ہے کہ

ہم کو اس موقع پر ابن ہشام، ابن سعد اور طبری میں کوئی رائے زنی نہیں ملی۔[2]

تو کیا واٹ کے نزدیک مذکورہ مورخین میں تنقیدی حس موجود نہیں تھی، پھر وہ اسی فقرہ میں اپنا موقف بدل کر یہ بھی لکھ جاتا ہے، کہ:

یہ ایسی قابل قبول بات ہے جسے بعد میں معجزہ قرار دیا جاسکتا ہے، کیونکہ رسولؐ کے پیرو کاروں اور عمومی حیثیت سے مسلمان نسلوں میں یہ صلاحیت بخوبی پائی جاتی ہے، کہ ہر ایسے واقعہ کو معجزہ بنا دیں جو مانوس طریقہ سے وجود میں نہ آیا۔"

دعوت اسلامی کی ابتدا کن حالات میں ہوئی اس پر واٹ کا جائزہ بڑا دلچسپ ہے، وہ

---

[1] واٹ: محمد ایٹ مکہ ص ۳۸، عربی ترجمہ۔ شعبان برکات مطبوعہ مکتبہ عصریہ بیروت [2] ایضاً

کہتا ہے کہ

محمدؐ کی دعوتی سرگرمیوں کے زمانہ کے جو حالات ہیں ان کے بارہ میں بڑی بے اطمینانی کا احساس ہوتا ہے، قدیم ترین روایات کی چھان بین کر کے ہم کوئی قابل اعتماد عمومی تصویر بنا سکتے ہیں، اگرچہ مختلف تفصیلات اور خصوصاً تاریخی وسائل کمزور اور ناپختہ حالت میں ہیں۔[1]

پہلی وحی | واٹ اس زمانہ کی حقیقی صورت حال کی کوئی قابل اعتماد تصویر بنا سکتا ہو تو دعوت اسلامی کے زمانہ کے تاریخی حالات کے بارہ میں آغاز کار کے طور پر ہم اس کے پیش کردہ شبہات کو قبول کر سکتے ہیں، ہمیں اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں ہوگا، مگر کیا واٹ اس زمانہ کی حقیقی تصویر پیش کرنے میں کامیاب ہوا ہے، وہ سیرت کا مطالعہ کرنے والے دوسرے مستشرقین کے مقابلہ میں اس ہم جوئی کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہے، لیکن اسلام کے خالص اور وسیع نقطۂ نظر سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ واٹ شک و ریب کی جھاڑیوں ہی میں پھنس کر رہ گیا ہے، اس زمانہ کی ایک نئی تصویر اس کے ہاتھ آئی، مگر اس طرح کہ اس کے حقیقی خد و خال گم ہیں، اور اسکی طرف وہ باتیں منسوب کر دی گئی ہیں، جن کا سرے سے کوئی وجود ہی نہ تھا، مثلاً وحی کے بارہ میں واٹ لکھتا ہے۔

تاریخ کی روشنی میں ایک ذراسی دشواری ہمارے سامنے یہ ہے کہ پہلی وحی کے اختتامی الفاظ (عَلَّمَ بِالْقَلَمِ. عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ) کا گذشتہ وحی سے تعلق ہے، مسلمانوں نے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ اللہ نے انسان کو قلم کے استعمال کرنے کا حکم دیا مگر یہ تفسیر بے فائدہ ہے، کیونکہ محمدؐ پڑھنے لکھنے سے

---

[1] محمد ایٹ مکہ ص ۹۳۔

واقف نہیں تھے، اور جن لوگوں سے آپ وابستہ تھے، ان میں ورقہ بن نوفل مسیحیت کی مقدس کتابوں سے واقفیت کی بنا پر نمایاں ہیں، اس لئے مذکورہ وحی کے آخری لفظوں کو محمدؐ نے جو بار بار دہرایا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ورقہ کے مرہون منت تھے، یہ سوچنا تو ایک فریب ہوگا کہ ناموس (جبرئیل امین) کی آمد پر ورقہ نے جو رائے دی تھی وہ ممنونیت کا اصل سبب تھی، مگر "اقرأ" سے پہلے ایسی چیز، جو وحی کا تقاضا ضرور پیدا ہوتا ہے، جس نے ورقہ کی رائے میں قوت اور زور پیدا کر دیا ہو، اسی لیے یہ فرض کر لینا بہتر ہوگا کہ محمدؐ نے ورقہ سے بہت پہلے مسلسل تعلقات پیدا کر رکھے تھے، اور ان سے بہت سی باتیں سیکھی تھیں، چنانچہ بعد کی اسلامی تعلیمات ورقہ کے افکار سے بہت کچھ متاثر ہوئی ہیں، اس بات سے محمدؐ پر نازل ہونے والی وحی اور گذشتہ وحی کے درمیان تعلق کی گتھی دوبارہ ہمارے سامنے آجاتی ہے[1]

(باقی)

---

[1] محمد ایٹ مکہ ص ۹۳

اسلام اور عربی تمدن

شام کے مشہور فاضل علامہ محمد کرد علی کی کتاب الاسلام والحضارۃ العربیہ کا اردو ترجمہ جس میں اسلام شارع اسلام تاریخ اسلام، اور تمدن و تہذیب اسلام پر مستشرقین یورپ اور علمائے مغرب کے اعتراضات کا نہایت تشفی بخش جواب دیا گیا ہے پھر یورپ پر اسلام کے زیر اثر مسلمانوں نے جو اخلاقی علمی اور تمدنی احسانات کئے، اور اس کے جو اثرات اور نتائج مترتب ہوئے، اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے، ترجمہ اتنا شگفتہ، رواں اور برجستہ ہے، کہ کتاب بجائے ترجمہ کے اوریجنل معلوم ہوتی ہے۔

از مولانا شاہ معین الدین ندوی۔ قیمت :- ۲۶ روپیے

کشمیر میں اسلامی ثقافت کے تاریخی مراحل

از

ڈاکٹر سید فاروق بخاری گورنمنٹ ڈگری کالج، نواکدل، سری نگر، کشمیر

(۲)

شاہمیری سلطنت کا زوال

سلطان زین العابدین تخت سلطنت پر نصف صدی تک پورے وقار و احترام کے ساتھ متمکن رہا، اس کی حکومت رعایا کی فلاح و بہبود، علوم و فنون اور تمدن کی گرم بازاری، اور مشترکہ ثقافت کی حفاظت و ترقی کے لحاظ سے پہلی اور آخری حکومت تھی، یہی وجہ ہے کہ عوام کا ہر طبقہ اس کا شکر گزار رہا۔

مگر زین العابدین کے انتقال کے فوراً بعد زوال و انحطاط کے آثار بھی نمودار ہونے لگے۔ خود وہ اپنے بیٹوں سے اپنی زندگی ہی میں مایوس ہو گیا تھا، چنانچہ جب اس کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا حیدر شاہ (۱۴۷۰ء تا ۱۴۷۲ء) تخت نشین ہوا تو اس نے اپنی عیش کوشی اور بدمستی سے اپنے عظیم اسلاف کی شاندار میراث کو پامال کرنا شروع کیا۔ اس نے ایک نائی پیکھی نارا کو اپنا خاص معتمد اور مختار بنایا[1]، اور خود رنگ رلیوں میں غرق رہتا، مورخ غلام حسن کھویہامی لکھتے ہیں۔

"حیدر شاہ دن رات لہو و لعب اور عیش کوشی میں ڈوبا رہتا تھا، یہاں تک

---

[1] راج ترنگنی۔ شری ور۔ ترجمہ سرلودت۔ ص ۱۸۶

کہ اس نے اپنے اسلاف کی روایات درہم برہم کیں"۱؎

ہندونائی پکتی تارا کے بارے میں یہی مورخ آگے لکھتا ہے،

"وہ جو بھی مشورہ بادشاہ کو دیتا تھا وہ اس پر عمل کرتا تھا، وہ لوگوں سے رشوت لیتا تھا، اور جس سے متنفر ہوتا سلطان کو اس کے خلاف بھڑکاتا تھا"۲؎

اس کے بعد دوسرے شاہمیری حکمرانوں کا حال بھی یہی رہا جو اپنے وزیروں اور بااثر لوگوں کے ہاتھوں میں کھلونوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے تھے، انھوں نے سلطان محمد شاہ کو چار مرتبہ اور فتح شاہ کو تین مرتبہ جب چاہا تخت پر بٹھایا، اور جب چاہا تخت سے اتارا ان سلاطین کی عدم اہلیت کی وجہ سے شاہمیری حکومت کا خاتمہ یقینی تھا، مگر چونکہ زین العابدین اور دوسرے متقدم سلاطین نے اسے بہت مضبوط بنیادوں پر استوار کیا تھا، اس لئے اس کے گرانے میں بھی نصف صدی تک کشمکش رہی۔

معاشرے کا بگاڑ سلاطین کی نالائقی اور سیاست دانوں کی کشمکش سے کشمیر جیسی چھوٹی مملکت کا نظم و نسق بگڑنے اور عوام الناس کے مزاج و مذاق کے متاثر ہونے میں کوئی دیر نہیں لگی مختلف بااثر قبیلوں نے سیاست کے اکھاڑے میں کود کر بدترین انتشار پھیلایا، پھر یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ زین العابدین نے اپنی طویل مدتِ حکومت کے دوران کئی بار اہم ملکی اور سیاسی مسائل کی خاطر بے جا توسّع اور عالی ظرفی کا مظاہرہ کیا تھا، جس سے کشمیر کے اسلامی ماحول پر برے اثرات مرتب ہوئے، خاص طور پر جو عناصر سیاسی فائدے اُٹھانے کی غرض سے دوسرے ملکوں سے یہاں وارد ہوتے تھے، انھوں نے بڑی اخلاقی بے راہ روی، مذہبی کش کش اور فکری پراگندگی پھیلائی، اگرچہ اس کا مقابلہ کرنے کے لئے اس وقت کے کچھ

۱؎ تاریخ حسن ج ۲ ص ۲۰۰ ۲؎ ایضاً

سربرآوردہ صوفیائے کرام اور خانقاہ نشین بزرگوں نے اس سیلاب کے آگے بند باندھنے کی ناقابلِ فراموش کوشش کی مگر منفی قوتوں کی یلغار اتنی سخت تھی کہ ان کا پورا استیصال ممکن نہیں ہو سکا، اس دور کے ممتاز روحانی پیشوا اور سیاست آشنا بزرگ حضرت سید محمد امین اویسیؒ نے اپنے ماحول کا نقشہ درجِ ذیل اشعار میں بڑی خوبصورتی سے کھینچا ہے؛ ؎

آزمودم جہاں و اہلِ جہاں — آنچہ ہستند آشکار و نہاں
ہمہ در بندِ خویشتن مشغول — ہمہ در کارِ خویشتن حیران
بے ترحّم بہ حالِ غم زدہ — نے تکلّف بہ لطف یا احسان
جملہ در قصدِ خونِ یکدگرند — اوفتادہ چو موش در انبان
کارِ شان نے بغیرِ کذّابی — یارِ شان نے بخلق جز بہتان
درمیان شان ہر آنکہ بہتر شد — ثمرۂ عصر و اعظمِ دوران
گر بود کارِ ساحری او را — بے بدانند موسئ عمران
کس نہ گوید کہ ایں خراں تا کے — جاں دہند از برائے یک لب نان

ان اشعار سے صاف پتہ واضح ہوتا ہے کہ اس دور میں کشمیر کے مسلمان بام ترقی و تہذیب سے گر کر ذلت کی کتنی پستی میں گر گئے تھے، حضرت اویسی نے ان اشعار میں ان کی توہم پرستی، بے غیرتی، دنیا طلبی، فریب کاری، بے ناگی، بعض بے مایہ لوگوں کی جاہ طلبی اور اربابِ سیاست کی خون خرابی اور دہشت گردی سے کھُل کر پردہ اُٹھایا ہے۔

چک قبیلے کا عروج شاہمیری حکومت زوال کی طرف بڑھنے لگی تو مختلف قبیلے اور خاندان اقتدار پر قابض ہونے کے لئے سرگرم عمل ہوئے اور وہ ایک دوسرے کو گرانے کے درپے ہوئے ان میں رینہ، چک، ماگرے، بٹ اور بیہقی سادات جیسے خاندان سیاست

ولامارت پر چھا گئے، اگرچہ اثر و رسوخ اور طاقت آزمائی میں یہ برابر تھے، تاہم چک قبیلہ ان سب پر غالب آگیا، اور کشمیر کا اقتدار کچھ وقت کے لیے ان ہی کو حاصل ہو گیا۔

میر شمس الدین عراقی اور کشمیر میں خالص ایرانی ثقافت کا ظہور

شاہمیری حکمرانوں کی نااہلی اور بدتوفیقی کی شہرت پھیلی تو ایرانی ممالک سے تعلق رکھنے والے کئی سیاسی طالع آزما اور مذہبی مشنریاں کشمیر میں وارد ہونے لگیں، وہ یہاں کی مٹی کی "زرخیزی" سے واقف تھے، اس لیے انھیں اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا، اس سے پہلے بھی کشمیر خفیہ تحریکیں چلانے والے داعیوں کی پناہ گاہ رہا ہے جو باطنی اور زندیق کہلاتے ہیں، خواند امیر کے مطابق جب ایران کے حکمران شاپور بن اردشیر پر مشہور ایرانی زندیق مانی کا مکر و فریب ظاہر ہوا اور وہ مانی کے قتل کے درپے ہوا تو مانی جن جن ملکوں میں روپوش رہا ان میں کشمیر بھی شامل تھا[1]، پروفیسر آرنلڈ کی تحقیق کے مطابق خوفناک اسماعیلی تحریک کے داعی کشمیر بھی آتے تھے، اور یہاں فقیروں اور درویشوں کی صورت بنا کر اپنی باطل تحریک کی اشاعت کرتے تھے[2]، عباسی حکومت کی جڑ کاٹنے والے مسلمانوں کا دینی مزاج وسیع پیمانہ پر بگاڑنے والے اور اسلامی ثقافت کی فضا مکدر کرنے والے برمکی وزراء کے اسلاف کشمیر کے تربیت یافتہ تھے[3]۔ ماضی قریب میں قادیانیت نمودار ہوئی تو کچھ وقت کے لیے کشمیر اس باطل تحریک کے لیے بھی صحت افزا مقام ثابت ہوا،

دسویں صدی ہجری میں ایران کے صفوی طالع آزما خالص ایرانی فکر و ثقافت کی نشر و اشاعت کا عزم لے کر نمودار ہوئے تو ان کا ایک داعی کشمیر بھی وارد ہوا، جس کا نام میر سید شمس الدین عراقی تھا، کشمیر کی تاریخوں کے مطابق وہ یہاں اپنے حکمران کی جانب سے سفارت کے فرائض

---

[1] تاریخ حبیب السیر فی اخبار افراد البشر: غیاث الدین حسینی (خواند امیر) ج ۱ ص ۲۰۰

[2] دعوت اسلام (آرنلڈ) اردو ترجمہ۔ مولوی عنایت اللہ مرحوم۔ مطبوعہ کراچی ۱۹۶۲ء ص ۲۳۴ - ۲۳۵

[3] معجم البلدان (یاقوت حموی الرومی) ج ۱۰ ص ۳۲۲ عنوان "نوبہار"

انجام دینے کی غرض سے وارد ہوا، مگر درپردہ پوری رازداری کے ساتھ مذہبی انتشار پھیلانے میں مصروف ہوا، وہ جہاندیدہ اور ہوشیار شخص تھا، اس لیے علانیہ اپنے مشن کا اظہار نہیں کیا، وہ پہلے شیخ الاسلام بابا اسماعیل کبرویؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوا، اور ایک معزز روحانی پیشوا کی پناہ حاصل کی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے مغلوج و بے اثر شاہمیری سلاطین کو درخور اعتنا نہ سمجھ کر ان وزراء اور سیاسی کھلنڈروں سے تعلقات قائم کیے جن کا مستقبل روشن تھا، ان میں ملک عیدی رینہ، موسیٰ رینہ، ملک محمد ناجی، ناجی چک وغیرہ جیسے سرکردہ لوگ ان کے جوشیلے حامی اور عقیدتمند بن گئے، یہی لوگ اس وقت سیاست و امارت پر چھائے ہوئے تھے،

میر شمس الدین نے وزراء اور سیاست دانوں کی پشت پناہی پر اپنی دعوت کا آغاز کھل کر کیا، انھوں نے اس پر نوربخشیت اور محبت اہل بیت کا لیبل چسپاں کیا اور حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ کے تئیں حسن ظن ظاہر کیا، اس کے ساتھ ہی انھوں نے اہل بیت کی تعظیم و تمجید اور صحابہ کرام کی شان میں مداہنت شروع کی، انھوں نے تمام سنی مسلمانوں کو باطل پرست قرار دے کر وسیع پیمانے پر ان کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا، کشمیر وارد ہوتے وقت حضرت خضرؑ نے انھیں "نصیحت" کی تھی،

"جاہل لوگوں، جھوٹے مذاہب کے ماننے والوں اور اندھے دل متعصب جماعتوں کو ائمہ معصومین کے مذہب کی طرف راہنمائی کرنی چاہیے"[1]

حضرت خضرؑ نے انھیں یہ نصیحت بھی کی کہ وہ کشمیر کے جملہ مسلمانوں کو چاہے وہ حنفی ہوں یا شافعی اپنا مذہب چھوڑنے اور ائمہ کا مذہب اختیار کرنے پر مجبور کریں[2]، میر شمس الدین عراقی نے اپنے رفقاء کی مدد اور وزراء کی پشت پناہی سے لوگوں میں نوربخشیت کی

---

[1] تحفۃ الاحباب قلمی نسخہ ریسرچ لائبریری سری نگر کشمیر

[2] مجالس المومنین۔ ص ۵۲

اشاعت کی، انھوں نے اس میں جو جابرانہ رویہ اختیار کیا، اس کا اندازہ انہی کے ایک
تذکرہ نگار ملا نور اللہ شوستری کے ان الفاظ سے لگایا جاسکتا ہے، لذا خ میں میر صاحب
کی تبلیغی خدمات اور امامیہ مذہب کی اشاعت کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

«میر شمس الدین عراقی کے وہاں پہنچنے کے وقت سے لے کر وہاں کے
تمام لوگ بشمول حکام و پولس مخلص شیعہ امامیہ ہیں، اور انھیں اپنی شیعیت میں
اس قدر غلو ہے کہ اگر کبھی کشمیر کے سنی یہاں آتے ہیں تو ان سے جزیہ لے لیتے ہیں[1]»

میر شمس الدین نے اپنی دعوت اور عقائد پر عربی میں احوط کے نام سے ایک کتاب
بھی لکھی، جس کے پیش لفظ ہی میں اپنے آپ کو "مامور و مبعوث" کی صورت میں پیش کیا ہے۔
انھوں نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ خدا نے انھیں امت محمدیہ کے اختلافات دور کرنے کے لیے
بھیجا ہے، اور آگے اس مقصد میں کامیاب ہونے کے بعد دوسرے مذاہب کے اختلافات
ختم کرنے کا حکم دیا[2]۔ اس کی ابتدا انھوں نے کشمیر کے مسلمانوں کو فاسق و فاجر، سنگدل،
کور باطن اور جھوٹے مذاہب کے پیروکار قرار دے کر کی، اس کے ساتھ ہی معاصر سنی
علماء اور مشائخ کی کردار کشی اور آبرو ریزی کی مہم تیز کی، جس کا واحد مقصد یہ تھا کہ عوام
کی عقیدت ان سے ختم ہو جائے اور لوگ سرگرداں ہو کر کسی دوسرے "مرکز" کی طرف

---

[1] مجالس المومنین، ص ۵۲ [2] اِنَّ اللّٰہَ اَمَرَنِی اَنْ اَرْفَعَ اختلافَ بینَ ہٰذہِ الامۃ اولاً فی الفروع و اُبَیِّنَ الفرعَ بعدَ المجد یہ کما کانت فی زمانہم من غیر زیادۃ و نقصان وثانیاً فی الاصول بین ہٰذہ الامۃ وکافۃ اہل العالم۔" (سراج الاسلام مطبع اعجازی حیدری منقول)
[3] پروفیسر مولوی محمد شفیع مرحوم کی تحقیق کے مطابق یہ وہی فقہ احوط ہے، جسے مرزا حیدر کاشغری نے نیست و نابود کرنے کی کوشش کی تھی۔

رجوع کرنے پر مجبور ہو چکے ہیں، انھوں نے خانقاہ میر سید علی ہمدانی کو منہدم کروایا اور جڈی بل میں
ایک دوسری خانقاہ "تعمیر کروائی، جسے میر صاحب نے کعبۃ اللہ کا درجہ دے دیا، اور اسی کا
"حج و طواف" کروایا[1]۔ میر شمس الدین کے بعض عقیدت مند تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ[2]
انھوں نے بہت سے مندر بھی منہدم کروا کر طاقت کے زور سے غیر مسلموں سے بھی اپنی تحریک منوائی
ممکن ہے، اس میں کسی حد تک صداقت بھی ہو کیونکہ میر شمس الدین کی جابرانہ تبلیغ ایک مسلمہ
تاریخی حقیقت ہے تاہم غیر مسلموں پر ہاتھ اٹھانے کے بارے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ
مبالغہ سے خالی بھی نہیں ہے، اگر ان کی مندر شکنی کی کیفیت وہی رہی ہوتی، جس کا نقشہ انکے
معتقدین نے پیش کیا ہے تو معاصر ہندو مورخوں نے اس کا ضرور ذکر کیا ہوتا، بلکہ وہ اسے بڑھا چڑھا
کر پیش کرتے، مگر وہ بالکل خاموش ہیں، اور صرف مسلمانوں کی باہمی تنازع اور فرقہ واریت پر ہنستے
نظر آتے ہیں[3]۔

مرزا حیدر دوغلات کاشغری اور نوربخشیوں کا استیصال

میر شمس الدین عراقی چکوں کے دور وزارت میں انتقال کر گئے۔ انھوں
نے اپنی زندگی ہی میں اپنے بیٹے میر دانیال کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا،
میر دانیال اور دوسرے نوربخشی مبلغوں نے اس تحریک کو ترویج دینے میں پوری دلچسپی لی۔ انھیں
وزراء اور باثر لوگوں کا تعاون حسب سابق حاصل تھا۔

میر شمس الدین عراقی کی مخالفت ان کی زندگی ہی میں شروع ہوئی تھی، اور ان کے خلاف
پورے کشمیر میں نفرت اور عداوت کی آگ پھیل گئی، اسی اثنا میں کاشغر کا مرزا حیدر دوغلات کچھ
نفل سپاہیوں کے ساتھ کشمیر میں داخل ہوا، اس نے حالات اپنے موافق دیکھے۔ وہ واپس جا کر
معقول فوجی طاقت کے ساتھ دوبارہ کشمیر میں داخل ہوا، اور کسی مزاحمت کے بغیر اقتدار پر

---

[1] تحفۃ الاحباب (قلمی)، ملا جمیل [2] ایضاً [3] راج ترنگنی، ترجمہ دت۔ ص ۴۰۳

قابض ہوا، اس نے مفلوج شاہمیری سلطنت برقرار رکھی مگر اختیارات کی باگ اپنے ہاتھ میں رکھی، اس نے اپنے مخصوص مزاج کے مطابق نوربخشیوں کو ہراساں کرنا شروع کیا۔ کچھ لوگوں کو مار ڈالا اور کچھ مرے ہوئے لوگوں کی قبریں اکھڑوا دیں، اس انتقام گیری سے نوربخشی سہم گئے، ان میں جو سیاسی کاروبار میں مشہور تھے، وہ روپوش ہوگئے، اور دوسرے تمام نوربخشیوں نے نوربخشیت سے تائب ہونے کی کوشش کی، مرزا حیدر نے فقہ احوط کا ایک نسخہ ہمایوں کے درباری علماء کے پاس ارسال کرایا کہ مؤلف کے عقائد کے بارے میں شرعی حکم دریافت جائے[1]۔ علماء نے اس کتاب کو گمراہ کن اور مؤلف کو ان عقائد پر مصر رہنے کی صورت میں مباح الدم قرار دیا، مرزا حیدر نے اس فتویٰ پر اس سختی سے عمل کیا کہ نہ صرف بربریت کی ایک دوسری روایت قائم ہوگئی، بلکہ خود مرزا حیدر اور اس کی اصلاحی تحریک ختم ہوگئی، ان لوگوں نے بھی جنہوں نے ابتدا میں اسے سر آنکھوں پر بٹھایا تھا، اس کی مخالفت شروع کی یہاں تک کہ اس کا سپہ سالار بھی اس سے پھر گیا، اس کے ساتھ جو کاشغری مغل کشمیر آئے تھے، وہ بھی اس کے زوال کا باعث بن گئے، عورتوں پر ان کی دست درازیاں عام ہوگئیں، مرزا حیدر ان پر روک لگانے کے بجائے بعض اوقات انہی کا پاس و لحاظ کرتا تھا، مرزا اسعد اللہ مرحوم نے اپنی منظوم تاریخ کشمیر میں اس افسوسناک صورت حال کا نقشہ ان اشعار میں کھینچا ہے۔ ؎

نیز بصورت دگر ضعفار — دست ترکاں بعنف گشت رسا

تبطاول دراز دست شدند — زاں رعایا ستودہ پست شدند

خواسفند داد اگرچہ مردم زار — حاکم اصلاً نگشت گوش گزار

پاس ترکان خود نمود ہمی — وز رعایا نخورد ہیچ غمی

[1] مرزا حیدر نے اس فتویٰ کو اپنی مشہور کتاب تاریخ رشیدی میں درج کیا ہے، ملاحظہ ہو اس کا انگریزی ترجمہ ص ۴۳۴، نیز ص ۴۳۴

کثرتِ مردمانِ کاشغری — کرد در دیدہ اش چو جلوہ گری[1]

کشمیری اور تہذیبی خدمات

مرزا حیدر کے مزاج کی درشتی نے اس کی اصلاحی تحریک کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا، ورنہ وہ بہت ہی اعلیٰ اوصاف کا مالک تھا، اور اس کی دس سالہ مدت امارت کے دوران کشمیر کے مسلمانوں کو بڑے فوائد پہونچے، وہ کٹر سُنّی اور پختہ حنفی تھا اور کشمیر میں اس نے سنیت و حنفیت کے سوا کسی دوسرے فرقہ یا فقہی مسلک کا وجود گوارا نہیں کیا، اس نے اپنے دور حکومت میں علم و فن کی آبیاری کی، وہ خود بڑا عالم، مصنف اور ادیب تھا، اس کے علم و فکر کا ثبوت اس کی مشہور کتاب تاریخ رشیدی ہے، جو مستند تاریخی معلومات کا مجموعہ ہے، اس کی علم دوستی، علماء پروری اور اہل فن و ادب کی حوصلہ افزائی نے یہاں کے لوگوں سے خراج تحسین وصول کیا، اسی طرح اس نے معاشی حالات بھی سدھارے اور سیاسی و انتظامی انتشار کا بھی خاتمہ کر دیا، مشہور عالم اور بزرگ حضرت شیخ حبیب اللہ نوشہروی کی زبان سے درج ذیل تعریف و تمجید مرزا حیدر کے اہل کشمیر پر غیر معمولی احسانات کے حق میں معتبر ثبوت کی حیثیت رکھتی ہے۔ ؎

من شنیدم کہ میرزا حیدر — بود در آن زماں شہہ صفدر

کز فراست کسے نبود چناں — کو کسی بود بودش او سلطان

در شجاعت چو او نہ رستم بود — در سخاوت چو او نہ حاتم بود

در طبابت حکیم حاذق بود — در عبادت عبید خالق بود

بود درویش دوست ہم درویش — چہ صفاکیش بود و نیک اندیش

طرح کشمیر اگر نکوست نکو — ایں ہمہ آمدہ از دست از و[2]

[1] باغ سلیمان (قلمی)، [2] دیوان حبی قلمی

اسی طرح مرزا سعد اللہ شاہ آبادی بھی اپنی منظوم تاریخ میں اعتراف کرتے ہیں۔

فضلا را بسے رعایت کرد — بر رعایا بجاں حمایت کرد
صحبت اہلِ حال کرد ہوس — گشت ہمدم بصاحبانِ نفس
داشت اہلِ کمال بیش عزیز — یافت زو اہلِ حرفہ نیز تمیز
خواست اربابِ صنع از ہر جا — ملک را کرد راست برگ و نوا
کرد موسیقی از نوازش ساز — باد ف و چنگ و نے بلند آواز
ہم عمارات مرتفع تعمیر — کرد و زو شد دریچہ کاغذ گیر
درشتِ نیز خشک سالی کرد — با ظرافت و پر آتش و شالی کرد
اختراعات او بدیع انواع — یافت در ملکِ بیشتر ابداع
تا بدہ سال ملک رانی کرد — عدل و انصاف دہر بانی کرد[1]

چک سلطنت کا قیام اور امامیہ مذہب کا تسلط

مرزا حیدر دوغلات کا خاتمہ کرنے کے ساتھ ہی چک وزرا اور ارباب سیاست سلطنت و حکومت پر غالب آئے انھوں نے آخری شاہمیری سلطان حبیب شاہ کے سر سے تاج اتارا اور اپنے ایک رہنما کے سر پر رکھا، اس کے ساتھ ہی شاہمیریوں کی سوا دو سو سالہ پرانی حکومت کی جان نکل گئی۔

چکوں کو کشمیر پر مستقل سلاطین کی حیثیت سے ۳۲ سال حکومت کرنے کا موقع ملا، انھوں نے نوربخشیت کی تجدید و احیاء میں اس قدر طاقت صرف کی کہ اس کا وجود پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط و مستحکم ہوا، تاہم اس میں ایک تاریخی تبدیلی رونما ہوئی،

میر شمس الدین عراقی اور ان کے رفقاء کسی گہری علمی اور فکری صلاحیت کے مالک نہیں تھے، انھوں نے یہاں قدیم باطنی داعیوں کی طرح طاقت و قوت ملنے پر جبر اور زور

۱؎ باب سلیمان (قلمی)

کی اپنی تحریک پھیلائی، اور جب بھی اس طاقت سے محروم ہوئے تو چھپ چھپ کر اور سینہ بسینہ اسے آگے بڑھایا، جب ان کا اور ان کے جملہ رفقاء کا انتقال ہوا تو اس تحریک کو نقصان پہونچا۔

میر شمس الدین عراقی کی تحریک مختلف عناصر کا ملغوبہ تھی جن میں غالی شیعیت اور ایرانی قومیت کا عنصر غالب تھا، صاحبزادہ حسن شاہ لکھتے ہیں:۔

"میر شمس الدین عراقی نہ صرف فرقہ امامیہ کے بانی تھے، بلکہ ان کی دعوت کشمیر میں ایرانی تہذیب اور فارسی زبان و ادب سے تعلق رکھنے کی حیثیت سے بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے، اس دعوت کے نتیجے میں کشمیر کے تعلقات وسط ایشیا کے بجائے ایران کے ساتھ مضبوط ہوئے"[1]

جب چک حکمرانوں کو میر شمس الدین کی تحریک کو مضبوط بنیاد پر استوار کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی تو انھوں نے امامیت ہی کی پناہ لی، اس طرح یہ تحریک اپنی انفرادیت کھو بیٹھی۔ چک حکمرانوں نے بزور طاقت امامی شیعیت مسلط کرنے کی کوشش کی، علمی اور فقہی مسائل میں ایرانی اہل علم مرجع قرار پائے۔

غازی خان چک سلطنت کا پہلا حکمران ہوا، اس نے منظم طریقے پر کشمیر میں شیعیت کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا، مورخ غلام حسن مرحوم لکھتے ہیں۔

اس نے شیعہ مذہب کو رواج دینے میں پورا زور صرف کیا، ہندوؤں اور سنی مسلمانوں کو اپنا مذہب چھوڑنے پر مجبور کیا،[2]

اس نے فارسی زبان کی ترویج میں بھی دلچسپی ظاہر کی، یہاں تک کہ سکوں پر بھی فارسی

۱؎ ثقافۃ الہند، دہلی بابت جولائی ۱۹۷۵ء۔ ۲؎ تاریخ حسن۔ ج۲، ص۲۲۲

عبارت کندہ کرانے کا حکم دیا، ایک دوسرے چک حکمران دولت چک کے بارے میں ایک شیعہ مورخ فخر سے لکھتا ہے:۔

"اس نے ہمدانی سلسلہ کے تمام درویشوں اور صوفیوں، اس سلسلے کے قواعد وشرائط اور نوربخشی طریقے کے آداب و رسوم کو از سر نو زیبائی بخشی"[1]

اسی طرح سلطان حسین خان چک کے بارے میں مؤرخ حسن لکھتے ہیں، کہ گو رعایا کی پرداخت اور انصاف کے قیام میں بھی آگے آگے تھا، تاہم مذہبی تعصب سے بھی خالی نہیں تھا۔

"مذہبی تعصب اور شیعیت اور اس کے رسومات کو رواج دینے کے لئے ہندوؤں اور سنی مسلمانوں سے ہمیشہ برسر پیکار رہا"[2]

اس خاندان کے دوسرے حکمرانوں کی حالت بھی یہی تھی، صرف یوسف شاہ چک ان سے مستثنیٰ ہے، وہ لہو و لعب اور ساز و سنگیت کا دلدادہ تھا، اور اسی میں اس کا سارا وقت گزرتا تھا، اس کے آزاد مشرب ہونے کی وجہ سے کشمیر کے معتوب مسلمانوں کو اس کے دور میں قدرے امن و سکون مل گیا تھا، یہی وجہ ہے، کہ کچھ اکابر علماء بھی اس کے شکر گزار نظر آتے ہیں۔

چکوں کے دور میں علماء اور مشائخ انتقام اور اذیتوں کا نشانہ بن گئے، ان علماء کو چن چن کر قتل کیا گیا، جنھوں نے مرزا حیدر کے زمانے میں نوربخشیوں کی مخالفت میں حصہ لیا تھا، علامہ فیروز مفتی[3] ان کے شاگرد محدث شمس الدین الماس، مولانا سید کمال، سید حسین خوارزمی،

۱؎ تاریخ بہارستان شاہی، قلمی۔ ۲؎ تاریخ حسن ص ۲۸۲۔ ۳؎ نزہتہ الخواطر مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب ج ۴ حدائق حنفیہ فقیر محمد جہلمی۔ تذکرہ علمائے ہند مولوی رحمان علی نولکشور، لکھنؤ ۱۹۱۴ء۔ ص ۱۶۶

سید منصور اور سید حمید وغیرہ بے دردی سے قتل کئے گئے،[1] ان میں سید حمید کی لاش ان کے سر کے بغیر دفنائی گئی، ایک اور بزرگ خواجہ فاضل شاہمو کو غازی خاں کے ایما پر زہر دیکر مارا گیا۔[2]

جسمانی سزاؤں میں ہاتھ پیر کاٹنا، آنکھوں میں گرم سلائیاں پھیرنا عام تھا، ایک عالم شیخ یعقوب کے جسم سے دائیں ٹانگ اور بایاں بازو جدا کر دیا گیا، انھوں نے باقی عمر کتابت اور عبادت میں گزاری۔[3]

قدیم شاہمیری حکمرانوں نے بہت سے علماء کو فکر معاش سے بری کرنے کی خاطر جاگیریں دی تھیں، چک حکمرانوں نے ان جاگیروں کو ضبط کر لیا، اس طرح ان کی علمی مجلسیں آسانی سے ختم ہو گئیں، بہت سے مدرسے بند ہو گئے اور خانقاہیں بے رونق ہو گئیں، علماء اور مشائخ نے وطن کو خیر باد کہنا شروع کیا، ملا عبدالصبور لکھتے ہیں:۔

"حضرت بابا اسماعیلؒ کے انتقال کے ساتھ ہی جب مذہبی فتنہ قوت کے ساتھ ابھر گیا، تو یہاں کے حکمراں نے حق و انصاف سے ہاتھ دھو کر بزرگان دین کو تکلیف پہنچانے کی کوشش میں لگ گئے، اس کے نتیجے میں اکثر بزرگوں نے کشمیر سے ہجرت کی اور وہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں سکونت پذیر ہوئے"[4]

اس دور کا سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ تھا کہ نوربخشی عوام چک حکمرانوں کی پشت پناہی کی وجہ سے مذہبی راہنماؤں کی شان میں بڑے گستاخ اور بے لگام ہو گئے تھے، وہ جہاں اور جس طرح چاہتے ان کی تذلیل کرتے تھے، اس دور کے ایک جلیل القدر عالم اور بزرگ علامہ داؤد خاکی[5] (مرید رشید سلطان العارفین شیخ حمزہ کشمیریؒ) "اہل مداہنت" کی حیا سوز بے باکی

۱؎ تاریخ اعظمی۔ لاہور ۱۳۰۳ھ ص ۹۱ ۲؎ باغ سلیمان قلمی ۳؎ اعظمی، ۴؎ خوارق السالکین (قلمی)،
۵؎ نزہتہ الخواطر۔ ج ۴ ص ۱۰۰، و تاریخ اعظمی ص ۱۰۶

دگستاخی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"جب اہل مداہنہ کشمیر کے حکمران ہوئے اور کھل کر اپنے باطن کا اظہار کرنے لگے تو انھوں نے سادہ لوح علماء کو سخت تکلیفیں پہنچائیں، کبھی انھیں کھانے پر بلایا تو اس کا نام (دعوت کے بجائے) رشوت رکھا، اور اس کو دو چند ادا کرنے کی مانگ کی، اگر کبھی ان کی تعریف وخوشامد کی تھی تو اب آمنے سامنے گالیاں بک کر ان کا معاوضہ چکانے لگے"[۱]

تذلیل واستہزاء کی یہ گرم بازاری دیکھ کر بہت سے علماء اور مشائخ پہاڑوں اور ویرانوں کی پناہ لینے لگے، اس طرح جو ملک دو سو سال تک علماء اور صوفیہ کا مرکز ثقل بنا ہوا تھا، اب ویرانی کا ہیبت منظر بن گیا۔ حضرت شیخ یعقوب صرفیؒ نے جو اسی دور سے تعلق رکھتے تھے، اپنی مایہ ناز عربی تفسیر کے مختصر پیش لفظ میں اس دور کے حالات کی طرف اشارہ کیا ہے، فرماتے ہیں۔

"زمانے کے حادثات اور وطن اور اہل وطن سے دور رہنے کے باعث میری حالت خراب ہوگئی، دل پراگندہ ہوا، یہاں تک کہ میں اس تفسیر کا ایک صفحہ کشمیر میں اور دوسرا ہندوستان میں لکھ رہا ہوں"[۲]

ارباب سیاست کی مزاحمت اور ناکامی | نوربخشی تحریک کو مختلف طبقوں کی طرف سے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا، ان میں ارباب سیاست وحکومت، علمائے دین اور مشائخ کرام سب شامل ہیں، تاہم یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس کوشش میں صرف مشائخ کو کامیابی

[۱] دستور السالکین شرح ورد المریدین، الیکٹرک پریس، لاہور، ص ۲۱۸ [۲] مطالب الطالبین فی تفسیر کلام رب العالمین (قلمی)، شیخ یعقوب عاصمی صرفی کشمیریؒ۔

حاصل ہوئی، جہاں تک ارباب اقتدار اور علماء کا تعلق ہے، وہ تشدد پسندی اور مصلحت کے شکار ہو کر اس تحریک کا استیصال کرنے میں ناکام رہے، مرزا حیدر دوغلات کی غارت گری اور بربریت سے فضا مسموم ہوگئی، وہ اگر چاہتا تو "حکمت وموعظت" پر عمل کرکے دعوت وتبلیغ کا سلسلہ شروع کرتا، مگر اس نے منتقمانہ طریق کار اپنا کر دشمنوں کو کچھ وقت کے لیے دبا کر ضرور رکھا مگر ان کو دوست نہیں بنا سکا، وہ یقیناً راسخ العقیدہ سنّی مسلمان تھا، مگر ان کمزوریوں سے پاک بھی نہیں تھا جن سے ارباب حکومت اقتدار پر جم کر رہنے کے لئے مدد لینے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں، یہی حال بیہقی سادات کا بھی تھا، جنھیں اس زمانے میں کشمیر کی حکومت وسیاست میں بڑا دخل تھا، وہ بھی نوربخشیوں کے سخت مخالف تھے، مگر اس کی آڑ میں وہ دوسرے مقاصد بھی پورا کرنا چاہتے تھے، ان میں میر سید محمد بیہقی، میر شمس الدین عراقی کی دختر سے نکاح کرنا چاہتے تھے، جب اس کے لئے اس نے میر صاحب عراقی کو پیغام دیا تو انھوں نے اسے نامنظور کیا تھا۔[۱]

حکمرانوں اور سیاستگروں کی انتہا پسندی سے عوام پر بھی نہایت برا اثر پڑا تھا، نفرت، بغض اور انتقام کی آگ لگ جانے سے عقائد بھی متزلزل ہونے لگے، اگر ایک طرف نوربخشی سبّ صحابہ جیسی بدعت کا ارتکاب کرتے تھے، تو اب بہت سے سنّی بھی اپنے مشتعل جذبات کو تسکین دینے کے لیے قابل افسوس رویہ اختیار کرنے لگے، اس دور کے ایک عالم، مدرس اور مصنف مولانا سلیمان کشمیری (فرزند مولانا ابوالفتح کلو مؤلف سیف السابین)[۲] نے اپنے ایک مختصر سے

[۱] تحفۃ الاحباب (قلمی) [۲] خزینۃ الاصفیاء، مولانا غلام سرور لاہوری ج ۲ ص ۳۵۸، حدائق حنفیہ، ص ۳۴۵۔ نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۱۴۲، تذکرہ علماء ہند، ص ۷۔ تاریخ حسن ج ۳ ص ۳۳۴۔

عربی رسالے کے پیش لفظ میں صاف الفاظ میں لکھا ہے، کہ اگر ایک طرف اہلِ مداہنت صحابہ کی شان میں گستاخی کرتے ہیں تو دوسری طرف کچھ سُنی بھی اہلِ بیت اطہار کے فضائل ومحامد سے انکار کرکے اپنا ایمان ضائع کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

"جب ہمارے اس دور میں اہلِ بدعت کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا تو انھوں افکار اور خیالات بگاڑ کر رکھ دیئے، نتیجہ یہ ہوا کہ خود بھی راہِ راست سے دور جا پڑے اور بہت سے دوسرے لوگوں کو بھی گمراہ کرڈالا، ان میں کچھ لوگ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی غیر معتدل محبت میں مبتلا ہوکر دوسرے خلفاء کی خلافت سے انکار کر بیٹھے اور دوسری طرف بعض لوگوں نے اہلِ بیت کی فضیلت سے انکار کیا (اللہ کی پناہ) خدا ایسے لوگوں کو اپنے قہر سے نابود کرے۔" [۱]

اسی بدعت کا مقابلہ کرنے کے لیے مولف نے یہ رسالہ لکھا ہے، اس میں انھوں نے صحابۂ کرام کے مناقب میں صرف وہ روایتیں پیش کی ہیں، جو اہلِ بیت سے مروی ہیں اسی طرح اہلِ بیت کی شان میں اُن روایات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے، جو خلفائے راشدین اور دوسرے اجلۂ صحابہ کی سندوں سے منقول ہیں، مؤلف سے پہلے اُن کے والد مولانا ابو الفتح کلو کشمیری نے بھی اسی موضوع پر سیف الساہین کے نام سے فارسی میں ایک کتاب لکھی تھی، جس کے قلمی نسخے آج بھی موجود ہیں۔

مصالحت پسند علماء کچھ لوگ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر حالات کو صرف دیکھنے ہی پر قانع تھے، کچھ علماء جاہ وحشم اور نمود ونمایش نیز دوسرے دنیاوی اغراض ومنافع کے اسیر ہوکر، خاموشی اختیار کئے ہوئے تھے، حضرت داؤد خاکیؒ نے ان اشعار میں دراصل اپنے دور ہی کے جاہ پسند علماء

[۱] مناقب الصحابۃ۔ (قلمی)

کی پردہ دری کی ہے۔ [۵]

فتویٰ و درس و قضا فی نفسہٖ خوبست لیک
فتنہ گر دو چوں بدستِ مردِ بدگوہر شد است

چارۂ دفعِ ریا جز نی نہ معمولِ فقیہ
حیلۂ اخذِ ربا صد باب چوں فرفر شد است

نیست عالم آنکہ بہرِ رشوت والتزامِ خلق
حیلہ ہائے نادرش محفوظ و مستحضر شد است

نیست عالم آنکہ غافل گشتہ از روزِ حساب
طالبِ دطامع باد تاف وزر وزیور شد است

تاہم علمائے دین ہی میں کچھ بزرگ ایسے بھی تھے جو مصالحت کے خواہاں تھے اور حکمرانوں اور خود غرض سیاستدانوں کی انتقامی کارروائیوں سے پریشان ہوکر دو فرقوں کو قریب لانے کے آرزومند تھے، ان میں سے کچھ لوگ تفضیلیت کی طرف مائل ہوئے، مشہور مدرس اور عالم حافظ ملا بصیر (استاد شیخ یعقوب صرفیؒ) کے بارے میں ایک نوربخشی مصنف نے لکھا ہے کہ وہ میر شمس الدین عراقی کے عقیدتمند اور مقلد ہوگئے تھے، [۱] سُنی مؤرخوں کی طرف سے اگرچہ کبھی اس کی تائید نہیں ہوئی، تاہم اسقدر انھوں نے اعتراف کیا ہے کہ اُن کے چند ممتاز تلامذہ (جن میں شیخ داؤد خاکیؒ بھی شامل تھے) اُن سے بدظن ہوگئے تھے، اور انھوں نے اُن کی درسگاہ میں آنا چھوڑ دیا تھا۔ [۲] اسی طرح ایک اور عالم جو مولوی حاجی کے عرف سے معروف تھے، اور بلند پایہ خطیب کی حیثیت سے مشہور ہوئے تھے، شیعیت سے متہم تھے،

[۱] تحفۃ الاحباب (قلمی) [۲] تاریخ اعظمی۔

مرزا حیدر دوغلات نے انھیں قتل کروایا تھا، جو اکثر سنیوں کو ناگوار گزرا تھا۔[1]

اگرچہ اس قسم کے علماء پورے خلوص اور نیک نیتی سے محض دو متحارب فرقوں کو قریب لانے کی غرض سے تفضیلیت کی جانب جھک گئے تھے، مگر یہ قربانی اُن کے لئے بہت مہنگی لگی اور ہر اعتبار سے بے فائدہ ثابت ہوئی، نوربخشیوں نے برسر اقتدار آکر جہاں راسخ العقیدہ سنیوں کو اپنے انتقام کا نشانہ بنایا وہاں مصالحت پسند علماء کا بھی مذاق اڑایا، اسی وجہ سے علامہ داؤد خاکیؒ نے ایسے علماء کو "شیخان بے فراست" سے یاد کیا ہے۔

مشائخ اور صوفیائے کرام کی کامیاب مدافعت

ارباب سیاست، رسمی اور مصالحت پسند علمائے دین کے علاوہ ایک اور طبقہ بھی تھا، جس نے اس دور میں سیاسی مخمصوں اور مناظرہ بازی سے دامن بچا کر نوربخشیوں کا مقابلہ کیا، اور ان کے لائے ہوئے سیلاب کے آگے ارشاد و تبلیغ کے ذریعہ مضبوط بند باندھا، انھوں نے شہروں اور دیہاتوں میں جا کر سادہ لوح مسلمانوں کا ایمان و یقین سنبھالا، ان میں سرفہرست شیخ الاسلام ملا اسماعیل کبرویؒ تھے، جنھوں نے سب سے پہلے میر شمس الدین عراقی کے عقائد کی قلعی کھول دی اور اس طرح ان کے حریف اول ٹھہرے، وہ اگرچہ بلند پایہ عالم اور علماء کے سرپرست تھے، مگر آخری دم تک خانقاہی زندگی گزاری، ان کے اصلاحی کارناموں کا تذکرہ آگے اُن کی دو عظیم الشان خانقاہوں کے تعارف میں آئے گا۔

شیخ اسماعیل کبرویؒ کے بعد جس دوسری عظیم روحانی شخصیت نے نوربخشی عقائد کے تاروپود بکھیرا وہ سلطان العارفین شیخ حمزہ مخدوم کشمیریؒ کی ذات تھی، اللہ تعالیٰ نے انھیں عظیم روحانی بصیرت سے نوازا تھا، اس لئے ہر قسم کی باطنیت اور شعبدہ بازی ان کے آگے

[1] تاریخ اعظمی۔

بے کار ثابت ہوئی، وہ تجر سوپور کے رہنے والے تھے، مگر مستقل قیام سرینگر میں کیا تھا، یہاں انھوں نے مختلف مسجدوں اور خانقاہوں میں سالہا سال قیام کر کے بے شمار بندگان خدا کا ایمان ضائع ہونے سے بچایا، یہ ان ہی کا مقام و مرتبہ تھا کہ اس وقت کے جلیل القدر ریشیوں نے جن کا تاریخ تصوف کشمیر میں اپنا علیحدہ مقام تھا، اور جو کشمیر کے معاشرے میں گہرے اثر و رسوخ کے مالک تھے، ان کے دست حق پرست پر بیعت کی اور ان ہی کی ہدایت و رہنمائی میں ریشیت کو شریعت کے سانچے میں ڈھالنے کا اہتمام کیا، حضرت شیخ حمزہ مخدومؒ کی اصلاحی و تربیتی تحریک کا ایک اہم جزو یہ بھی تھا کہ انھوں نے اس اصل مرض کی بھی نشاندہی کی جس سے عوام میں باطل تحریکیں پنپتی ہیں، اور عقائد و اعمال میں تزلزل اور بےچینی واقع ہوتی ہے، یہ مرض "بے قید تصوف" ہے۔ حضرت شیخ حمزہؒ نے اپنے دور کے بے لگام صوفیوں کو اپنے قریب آنے کا بھی موقع نہیں دیا، اسی طرح اپنی روحانی مجلسوں میں غیر شرعی اعمال و وظائف کو جگہ دینے کی اجازت نہیں دی، ان کا ایک عظیم کارنامہ یہ بھی ہے کہ اپنے صاحب علم مریدوں کو لوگوں کی تربیت پر مامور کیا، جن کی مساعی جمیلہ سے ہی تبرا اور مداہنت کا خاتمہ ہو کر اصحابِ رسول اللہ ﷺ کا احترام و تقدس مسلمانوں میں بحال ہوا، ان کے ایک فاضل جلیل شاگرد حضرت داؤد خاکیؒ نے اپنی تصانیف[1] کے ذریعہ اس اصلاحی تحریک کو استحکام عطا کیا، اور اس طرح صحیح اصلاحی تحریکیں مسخ کرنے والوں کو بے دست و پا کر کے رکھ دیا۔

چک دور حکومت کے سرکردہ مدارس اور خانقاہیں

چک امراء اور سلاطین کی ساری زندگی سیاسی آوارہ گردی اور فرقہ واریت کو ہوا دینے میں صرف ہوئی، اُن کے پچاس سالہ

[1] مثلاً ورد المریدین۔ دستور السالکین، رسالۂ غسلیہ، رسالۂ جلالیہ، رسالۂ ضروریہ، مجموعۃ الفوائد، قصیدہ لامیہ وغیرہ۔

دو وزارت و سلطنت میں کسی بھی غیر معمولی مدرسے یا تربیت گاہ کا سراغ نہیں ملتا ہے، البتہ وزیر اعظم موسیٰ رینہ اور سلطان حسین شاہ چک ان سے مستثنیٰ ہیں، موسیٰ رینہ نے میر شمس الدین عراقی کے لیے ایک دعوتی مرکز کی تعمیر میں بے حد دلچسپی ظاہر کی تھی، یہ وہ زمانہ تھا، جب میر صاحب عراقی حضرت میر سید علی ہمدانیؒ کی خانقاہ منہدم کرنے اور ایک دوسری خانقاہ تعمیر کرنے میں سرگرم عمل ہوئے تھے، موسیٰ رینہ نے عملاً اس میں ان کا ہاتھ بٹایا تھا، میر صاحب کی بنائی ہوئی خانقاہ آج بھی موجود ہے، اور شیعہ فرقہ کے لوگوں کے لئے بڑی اہم تربیت گاہ کی حیثیت رکھتی ہے، اس نے زمانے کے کئی نشیب و فراز بھی دیکھے، فرقہ وارانہ فسادات کے موقعوں پر کچھ فرقہ پرست سنی مسلمان اسے نذر آتش کرتے تھے، جس سے شیعوں کے ساتھ ساتھ سنی مسلمانوں کو بھی دکھ پہنچتا تھا، اور وہ اس کا برملا اظہار بھی کرتے تھے،

اسی طرح سلطان حسین شاہ چک نے اپنے دور سلطنت میں ایک دار العلوم بنوایا جس کے مصارف پورا کرنے کی غرض سے کئی دیہاتوں کی آمدنی وقف مدرسہ رکھی، اس نے حضرت شیخ فتح اللہ حقانی کو اس کا صدر مدرس اور شیخ درویش شیرازی کو ان کا معاون مقرر کیا۔ اول الذکر حنفی المذہب سُنی عالم تھے، جب کہ شیخ شیرازی شیعہ تھے، شیخ حقانیؒ نے کچھ ہی دنوں بعد مدرسے سے ترک تعلق کیا، اس کے بعد انھوں نے کشمیر کو خیرباد کہہ کر سیالکوٹ میں قیام کیا، اور یہیں درس و تدریس کا مشغلہ جاری کیا، اس کے ساتھ ہی ان کے داماد اور عزیز شاگرد ملا کمال الدین (استاد مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ ملا عبد الحکیم سیالکوٹیؒ و سعد اللہ علامی) اور ملا جمال الدین بھی یہیں وارد ہوئے، انھوں نے مدت دراز تک یہاں درس دیا۔ شیخ فتح اللہ حقانیؒ کے شاگردوں میں حضرت شیخ حمزہ مخدومؒ بھی تھے۔

حسین خان ہی نے شیخ حبیب اللہ خوارزمی کو شیخ الاسلام مقرر کیا تھا، وہ بڑے بے باک اور جرأت مند عالم تھے، انھوں نے سنی عقائد پر عقائد کے نام سے ایک رسالہ لکھا تھا، جس میں خلافت اور امامت پر بحث کر کے اہل سنت کے موقف کی تائید کی، ملک کے شیخ الاسلام ہونے کے باوجود ان پر قاتلانہ حملہ کیا گیا۔ اس میں وہ بچ گئے، مگر حملہ ایک مستقل سیاسی تحریک کا باعث بن گیا۔ تفصیل آگے آتی ہے۔

شیخ اسماعیل کبرویؒ اور ان کی خانقاہیں

اگرچہ سلاطین کی جانب سے زین العابدین کے بعد کسی بھی حکمراں نے علوم و فنون اور ادب و ثقافت کی آبیاری نہیں کی مگر علمائے دین کبھی بھی اپنے فرائض سے غافل نہیں رہے، وہ حوصلہ شکن حالات میں بھی اپنی منصبی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتے رہے، اگرچہ حکمرانوں کی جانب سے نئی درسگاہوں کی تعمیر کا سلسلہ یک قلم رک گیا، مگر علماء کی اقامت گاہیں اور صوفیہ مشائخ کی خانقاہیں مستقل تعلیمی اور تربیتی ادارے بن گئے، ہم یہاں ان میں سے کچھ ممتاز اداروں کا حال بیان کرتے ہیں،

حضرت شیخ اسماعیل کبرویؒ، جیسا کہ ہم نے اوپر میر شمس الدین عراقی کے حالات میں ذکر کیا ہے، آخری شاہمیری دور اور ابتدائی چک عہد کے بلند پایہ عالم دین اور ولی کامل تھے، کشمیر میں انھوں نے ایک ایسے دور میں مذہب اہلسنت والجماعت کی مدافعت میں سرگرم حصہ لیا، جب سنی علماء اور مشائخ ناامیدی کے شکار ہو کر ہجرت یا خلوت اختیار کر رہے تھے، انھوں نے بڑی حوصلہ مندی سے تدریس، تبلیغ اور خانقاہی تربیت کو فروغ دے کر بدعت کی خوفناک یلغار کا مقابلہ کیا۔ وہ اپنے وقت کے شیخ الاسلام تسلیم کئے جاتے ہیں، بڑے بڑے اصحاب مناصب تک ان کی رسائی تھی اور ان کی خانقاہ میں سینکڑوں لوگ بیک وقت اطمینان سے کھانا کھاتے تھے، مگر خود ان کی بے نفسی اور خدا ترسی کا یہ عالم تھا کہ

بستر مرگ پر جب احباب میں سے کسی نے پوچھا، یہ کیا ضروری تھا کہ سارا مال فقیروں میں بانٹ دیا اور اپنے بیٹے کو بے نوا چھوڑ دیا تو جواب دیا۔

"درویشوں (یعنی خانقاہ نشینوں) کا مال ان کے اور فقراء کے درمیان مشترک ہوتا ہے، میں نے اپنے بیٹے کے لیے اس لئے کچھ نہ چھوڑا ہے کہ اگر اسکا کردار و عمل ٹھیک ہے، تو مجھ پر اس کے مصارف کا پورا کرنا لازم نہیں ہے"۔[1]

حضرت شیخ کی گوناگوں خدمات اذکار ناموں میں ان کی دو عظیم الشان خانقاہوں کی سرپرستی تھی، یہ خانقاہیں بیک وقت صوفیہ اور سالکوں کی ممتاز ترین تربیت گاہیں درس وتدریس کا مشغلہ رکھنے والوں کے لئے درس گاہیں، عراق اور خراسان کے طلبائے علم کے لئے لنگر اور اقامت گاہیں اور تصنیف وتالیف میں دلچسپی رکھنے والوں کے لئے شاندار کتاب گھر تھیں، مورخ محمد اعظم دیدہ مری لکھتے ہیں کہ ان خانقاہوں میں فقراء اور صوفیہ کے علاوہ ان غیر ملکی طلبہ کے لیے بھی مفت کھانا میسر تھا جو حصول علم کی غرض سے کشمیر میں موجود ہوتے تھے۔

"مسافروں کے علاوہ فقراء اور طلباء علم کثیر تعداد میں یہاں آمد و رفت رکھتے تھے ماوراءالنہر اور ہرات جیسے ممالک سے تعلق رکھنے والے طلبہ یہاں آتے تھے، اور ان کی خانقاہ کے لنگر سے کھانا کھاتے تھے" (تاریخ اعظمی ص۳۴)

خانقاہ میں کتابوں کا ذخیرہ مہیا رکھنے کی طرف مورخ اعظمی اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "بہت سی کتابیں دیگر لوازم کے ساتھ خانقاہ میں وقف رکھیں"۔ (ایضاً)

اس دور میں حضرت میر سید علی ہمدانیؒ کے نقوش مٹانے کی کوشش اور سازش کی جارہی تھی، جسے علمائے تصوف اور مشائخ "اہل مداہنت کی یلغار" سے تعبیر کرتے تھے،

[1] خوارق السالکین (قلمی)

اس لیے ضرورت اس امر کی تھی کہ حضرت امیر کبیرؒ کے ایک ایک نقش پا کو مستقل مشعل راہ بنا دیا جائے، اس سلسلے میں حضرت امیر کبیرؒ نے خود ہی اپنی تشریف آوری کے زمانے میں کشمیر کے مسلمانوں کو اوراد فتحیہ کے نام سے ایک مجموعہ اذکار بطور ارمغان عطا کیا تھا، انھوں نے ہر نماز کے بعد اسے اجتماعی صورت میں بجہر پڑھنے کا بھی اہتمام فرمایا تھا، یہ مجموعہ اوراد و اذکار باطنی فیوض وفوائد رکھنے کے ساتھ ساتھ بے شمار ظاہری فوائد کا بھی حامل رہا ہے، اس کے بجہر اور غنائیت سے بھرپور لہجے میں پڑھنے سے اسلام کے عناصر ترکیبی جیسے توحید ورسالت پر ایمان ویقین، ذات اقدسؐ پر درود وسلام، آپؐ کے آل وصحابؓ کے فضائل ومحامد کا اعتراف، اولیاء اللہ سے محبت اور ان کے حق میں دعائے مغفرت وغیرہ کا علی الاعلان اور بکمال جذب ووجد اظہار ہوتا ہے، اور مجموعی طور پر مسلمانوں کی اجتماعی قوت اور مذہب اہل سنت والجماعت کے برحق ہونے کا صحیح منظر پیش کرتا ہے،

حضرت امیر کبیرؒ کے بعد آپ کے جملہ رفقاء اور منتسبین نے ہر دور میں اس کے ورد پر بڑی شدت سے مداومت کی[1]، یہاں تک کہ آج بھی یہ مجموعہ اوراد کشمیر کے ہزار ہا ہزار لوگوں کی نوک زبان پر ہے، اور اسے روزانہ انفرادی اور اجتماعی صورت میں پڑھتے ہیں، اس میں شک نہیں کہ اس نے بروقت دانستہ طور پر گمراہیاں پھیلانے والوں کی سازش ناکام بنادی ہے، حضرت شیخ اسماعیل کبرویؒ نے اپنے پر آشوب دور میں اپنی خانقاہ میں اوراد فتحیہ پڑھانے کا وسیع پیمانے پر انتظام کیا تھا، محمد اعظم لکھتے ہیں۔

"ہر روز چار سو اوراد پڑھنے والے صوفی منش بزرگ یہاں حاضر ہوتے تھے

[1] حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب دہلویؒ بھی سلسلہ کبرویہ سے منسلک ہونے کے بعد بعد نماز فجر اوراد فتحیہ پڑھا کرتے تھے جیسا کہ ان کے نامور فرزند حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اسکا اعتراف کیا ہے۔ ملاحظہ ہو انتباہ فی سلاسل الاولیاء

اور حضرت شیخ ہی سے روزینہ بھی پاتے تھے۔" (تاریخ اعظمی - ص ۴۴)

حضرت شیخ کی دو خانقاہوں میں ایک خانقاہ موجودہ جامع مسجد سرینگر کے متصل واقع تھی، یہاں پر ان کے اسلاف محوِ خوابِ ابدی ہیں اور دوسری خانقاہ کوہ ماران کے دامن میں واقع تھی اور خود حضرت شیخ اسی کے احاطے میں دفن کیے گئے۔ حضرت شیخ کی یہ دونوں خانقاہیں اپنے زمانے میں کشمیر کی تمام دوسری خانقاہوں میں مشہور و ممتاز تھیں، یہ دونوں خانقاہیں (بشمول مطبخ و کتبخانہ) ۱۰۹۰ھ تک موجود تھیں، بالآخر ان میں ایک مسلمانوں کی بے توجہی سے خود بخود ختم ہو گئی اور دوسری آگ کے ایک حادثہ میں تباہ ہو گئی، ان خانقاہوں کو اپنے دور میں جو شرف و امتیاز حاصل تھا، اس کا اندازہ لگانے کے لئے صرف اتنا ہی کہنا کافی ہو کہ دور دراز کے دیہات سے زمیندار اپنی کمائی کا عشر حضرت شیخ کی ان ہی خانقاہوں میں پہنچاتے تھے، حضرت شیخ حمزہ مخدوم کشمیریؒ کے اسلاف اپنے آبائی گاؤں تجر (سوپور) سے اپنا عشر و زکوٰۃ وغیرہ یہاں پہنچاتے تھے، حضرت داؤد خاکی اپنے مرشد کے اسلاف کی دینداری و خدا ترسی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"حضرت شیخ حمزہؒ کے اسلاف کی دینداری اور نیک نیتی کی ایک کھلی نشانی یہ بھی تھی کہ وہ ہر سال زکوٰۃ اور عشر کے نام پر میوہ، مویشی اور دوسرے اجناس کا بیشتر حصہ حضرت شیخ اسماعیل کی خانقاہ میں پہنچاتے تھے، جو اس وقت ظہر (سرینگر) میں سنیوں کے پیشوا تھے۔" (دستور السالکین۔ ص ۴۴۔ لاہور ۱۳۹۶ھ)

حضرت شیخ کی یہ خانقاہیں مذہب اہل سنت والجماعت کا مستحکم قلعہ تھیں، ان کی بدولت حضرت امیر کبیر کی بنائی تاریخی خانقاہ کی رونق عود کر آئی تھی، ارباب سیاست میں شمسی چک حضرت شیخ کا مخلص عقیدت مند تھا، اس نے بھی انکی یاد میں ایک دو منزلہ خانقاہ تعمیر کرائی تھی جو ہر وقت صلحاء سے معمور رہتی تھی (اعظمی ص ۴۴) (باقی)

اورنگ زیب عالمگیر
کی
مذہبی رواداری

(۲)

از جناب عبد الرؤف صاحب ایم۔ اے اوڈی کلاں (راجستھان)

مندرجہ بالا شواہد کے پیش نظر بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اورنگزیب نے صلاحیت، قابلیت اور استعداد کو اہمیت دیتے ہوئے ہر مذہب و ملت کے افراد کے لیے شاہی ملازمتوں کے دروازے کھول رکھے تھے جو انکی مذہبی فراخ دلی کی بین دلیل ہے یہی نہیں بادشاہ اپنے امراء کے رنج و راحت میں بھی برابر شریک رہتا تھا، بخشی الممالک روح اللہ خان جب بستر مرگ پر آخری سانسیں گن رہا تھا تو بادشاہ بہ نفس نفیس اس کی عیادت کو گیا اور اسے تسکین دیتے ہوئے کہا کہ انسان کو کسی حال میں بھی رحمت خداوندی سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے، اپنی جو خواہش ہو بتلائیے، اسے پورا کیا جائے گا، چنانچہ اس کے حسب خواہش اورنگزیب نے اس کی اولاد کے ساتھ ہمیشہ نہایت فیاضانہ سلوک روا رکھا،[1]

[1] اینکڈوٹس آف اورنگزیب ص ۳ - ۱۲۲ نیز مغل ایڈمنسٹریشن ص ۱۲۷

خواجہ سربلند خان جو اکتوبر ۱۶۷۲ء سے ۲۰ دسمبر ۱۶۷۹ء (وفات) تک بخشی دوئم کے عہدہ پر مامور رہا، تقیہ کیے رہتا تھا، ایک دفعہ بادشاہ نے اس سے پوچھا کہ تمہاری باتوں سے بعض اوقات شیعیت کی بو آتی ہے، تو اس نے جواباً عرض کیا کہ "جہاں پناہ! ہمارے بہت سے سید اس فرقہ (شیعیت) سے تعلق رکھتے ہیں، مجھ پر بھی ان کی سابقہ مصاحبت کے سبب شیعیت کے کچھ اثرات باقی ہیں، لیکن میں اس فرقہ کا غالی معتقد نہیں ہوں، میں نے خود کو اس فرقہ سے علٰحدہ کر لیا ہے، تاہم مکمل طور پر اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکا ہوں۔" بادشاہ اس کے جواب پر صرف مسکرا کر رہ گیا،[۱] کسی قسم کی بازپرس نہ کی، اس سے ثابت ہے کہ وہ لوگوں کے ذاتی معتقدات میں دخل دینا پسند نہیں کرتا تھا، یہی سربلند خان ایرانیوں کا بڑا طرفدار تھا، اور بادشاہ سے ان کے لیے اعلیٰ مناصب اور بلند عہدوں کی سفارشیں کیا کرتا تھا، اس کی سفارش پر بادشاہ نے ایک ایرانی کو کابل کا گورنر مقرر کیا تھا، محکمۂ دیوانی پر تو شیعہ مکمل طور پر قابض تھے، سادات بارہہ (جنکی اکثریت شیعہ تھی) کی حیثیت تو اتنی مضبوط تھی کہ وہ خودسر ہو گئے تھے، ایک دفعہ بادشاہ کے درباریوں میں خانہ جنگی کر ڈالی، اور جب اورنگزیب نے حکم دیا کہ معاملہ قاضی کی عدالت میں پیش کیا جائے تو سادات بارہہ نے کہا کہ ہم اپنا فیصلہ خود کریں گے، بادشاہ شریعت کے مقابلہ میں اس خودسری اور غرور پر برہم ہو گیا، اور کہا کہ جو لوگ میری شمشیر پر ان کا مزہ چکھ چکے ہیں، وہ شریعت غرا کے حکم کے بالمقابل ایسے الفاظ منہ سے نکالتے ہیں، کہ دو

---

۱ اینک ڈوٹس آف اورنگزیب ص ۴۴ ۔ نیز مغل ایڈمنسٹریشن، ص ۱۲۶

ب مل کر آ جائیں، پھر یہ حکم دیا کہ پہرے وغیرہ پر جس قدر سادات ہیں ہر طرف کر دئے جائیں، یہ سن کر سادات بارہہ کی خودسری ختم ہوئی۔[۱]

معاشی اعتبار سے بھی عہد عالمگیر میں ہندو اور شیعہ خصوصاً اسماعیلی[۲] و داؤدی بوہرے[۳] ملکی تجارت پر پوری طرح قابض تھے، اس وقت کے باب الہند یعنی

---

۱ اورنگزیب عالمگیر پر ایک نظر از علامہ شبلی نعمانی، ص ۱۲۵ مطبوعہ ۱۹۶۰ء

۲ اسماعیلی شیعہ سیدنا امام جعفر صادقؒ (م ۱۴۸ھ) کے صاحبزادہ سیدنا اسماعیل سے انتساب کے سبب اسماعیلیہ کہلاتے ہیں، ان کا دوسرا نام تعلیمیہ بھی ہے، یہ امامیہ (اثنا عشری) فرقہ کی ہی ایک شاخ ہے، جو جمہور امامیہ سے سیدنا جعفر صادقؒ کی جانشینی کے بارہ میں اختلاف رکھتا ہے، چنانچہ صرف سات اماموں کو تسلیم کرنے کے سبب ابتداء میں سبعیہ بھی کہلاتا تھا، ملاحظہ ہو، مذہب اور باطنی تعلیم از مرزا محمد سعید دہلوی ایم۔ اے۔ آئی۔ ای۔ ایس، صفحات ۲۱۵ تا ۲۲۰ نیز ص ۳۲۳-۳۲۴

۳ لفظ بوہرا ہندی زبان کے لفظ "بیوہرا" (ब्योहरा) سے مشتق ہے، جس کے لغوی معنی قرض دینے والا یا تاجر ہے، کہا جاتا ہے، کہ بوہروں کا پہلا داعی عبد اللہ یمن سے روانہ ہو کر ہندوستان میں کھنبایت (صوبہ گجرات) کے ساحل پر ۱۰۶۷ء میں وارد ہوا، اس کی تبلیغی مساعی نے قلیل عرصہ میں حیرت ناک کامیابی حاصل کی یہاں تک کہ گجرات کا راجہ سدھ راؤ جے سنگھ اور اس کی رعایا کی اکثریت اسماعیلی ہو گئی۔

ہندوستان کے بوہرے داؤدی اور خوجے اسماعیلیہ ہی کے باقیات ہیں، ان میں بوہرے نسبتاً ممتاز حیثیت کے مالک ہیں، بوہرہ اسماعیلیہ جماعت دو بڑے فرقوں میں منقسم ہے، جن میں سے ایک داؤد بن قطب شاہ کی رعایت سے

(بقیہ حاشیہ ص ۲۱۶)

بندرگاہ سورت پر یا تو ہندو بنیوں کا اختیار تھا، یا بوہروں کا سورت کا سوداگر
بہارجی بوہرہ تو اس وقت دنیا کا متمول ترین تاجر (ملک التجار) سمجھا جاتا
تھا، اس کے بعد حاجی سعید یا سعید بیگ، اور حاجی قاسم کا شمار تھا، ہندو بنیے
اور چند بوہرے کی دولت کا بھی کوئی حساب نہ تھا، جس سے خود شہنشاہ
اورنگزیب بوقت ضرورت لاکھوں روپیہ قرض لیا کرتا تھا، ایک دفعہ اس سے
بادشاہ نے چار لاکھ روپیہ قرض مانگا تو اس نے عرض کیا کہ جہاں پناہ
جس سکہ کا نام فرمائیں، مطلوبہ رقم اسی سکہ میں حضور کے قدموں پر نثار
کردی جائے، واضح ہو کہ اس وقت سورت میں آٹھ قسم کے سکے رائج تھے
یعنی طلائی روپیہ، اٹھنی، چونی اور علی الترتیب یہی نقرئی سکے نیز طلائی
گوٹرا اور نقرئی لرین) ان آٹھ قسموں کے سکوں میں سے وہ چار لاکھ روپیہ
کسی بھی ایک سکہ میں پیش کرنے کو تیار تھا، ایک مصری یوروپین سیاح نے
لکھا ہے کہ مغل اعظم (اورنگزیب) ایسے قرضوں کو بالعموم ابواب (مالگذاری)
کی وصول یابی پر ادا کر دیتا ہے، اور ادائگی حسب وعدہ اتنے معینہ وقت پر ہوتی ہے
کہ اسی لیے اس کو جتنی رقم کی ضرورت ہوتی ہے، وہ فوراً مل جاتی ہے، رعایا کہ بادشاہ

(بقیہ حاشیہ صـ ۲۱۵) داؤدیہ (داؤدی) اور دوسری شاخ سلیمان بن یوسف
کی نسبت سے سلیمانیہ کہلاتی ہے، عددی لحاظ سے داؤدی فرقہ کو غلبہ حاصل ہے چونکہ
اس فرقہ کی اکثریت ہندو نژاد ہے، اس لیے اسماعیلیوں کے بعض فرقے بہت سے
ہندوانہ رسم ورواج اور اعمال وعقائد مثلاً حلول وتناسخ کے قائل ہیں اور فاطمی
خلیفہ حاکم کو خدا کا اوتار تسلیم کرتے ہیں، ان عقائد کے سبب عام مسلم مورخین کا ان سے اظہار
بیزاری کا کرنا حیرت کی بات نہیں ہے،

ہے جتنا زیادہ امن وسکون حاصل ہوتا ہے، اتنا ہی زیادہ فراخ دلی کے ساتھ
رعایا بھی اپنی تھیلی کا منہ شہنشاہ کے قدموں پر لاکر کھول دیتی ہے، یہاں یہ ثابت
ہوتا ہے کہ اگر اورنگزیب ہندو اور شیعوں کے استحصال اور استیصال پر
تلا ہوا تھا تو انھیں نہایت مفلس اور قلاش ہو جانا چاہئے تھا، دراصل ہندوؤں
اور شیعوں کا استحصال اورنگزیب نے نہیں بلکہ سیواجی نے کیا، پہلی دفعہ ۵ جنوری
سنہ ۱۶۶۴ء بروز بدھ بوقت ۱۱ بجے دوپہر سے ۸ جنوری سنہ ۱۶۶۴ء بروز اتوار
بوقت ۱۱ بجے دوپہر تک سیواجی اور اس کے غارت گر ہمراہی سورت کے
لوگوں کو لوٹتے اور مکانوں کو نذر آتش کرتے رہے، جمعرات وجمعہ کی درمیانی
شب آتش زنی کے سبب نہایت مہیب تھی، آگ کے شعلوں نے شب دیجور
کو روشن دن میں اور دھوئیں کے کالے بادلوں نے روشن دن کو سیاہ رات
میں تبدیل کر دیا تھا، دھواں اتنا گہرا تھا کہ اس نے ایک گھنے بادل کی طرح
سورج کو ڈھانپ لیا تھا، بہارجی بوہرہ کے محل کو اس نے جمعہ کی رات تک
جی بھر کر لوٹا، فرش کھود ڈالا گیا، اور اس کے بعد محل کو نذر آتش کر دیا گیا،
یہاں سے اس کو ۲۸ سیر بڑے بڑے موتی، بہت سے لعل جواہر اور زمرد،
نیز دوسری بے شمار دولت حاصل ہوئی، دو تین ہندو تاجروں کو بھی کئی کروڑ کا
نقصان برداشت کرنا پڑا، اس لوٹ کے بعد ایک دن ۲۶ آدمیوں کے سر اور
۲۴ آدمیوں کے ہاتھ کاٹ کر پھینک دیے، انگریزوں کی کوٹھی کے قریب حاجی سعید بیگ کا

سلہ سیواجی اینڈ ہز ٹائمز۔ ص ۹۷ نیو ہسٹری آف دی مرہٹاز، ص ۱۷۱، کریسنٹ
ان انڈیا۔ ہندی ترجمہ ص ۵۹۰ نیز دروہ کا جھادیہ (ہندی) ص ۱۰۶، مصنف سرودیش

محل اور گودام تھا، بدھ کی دوپہر کو مرہٹے اس میں داخل ہوئے، تمام دروازوں اور صندوقوں کو تہس نہس کر ڈالا، محل میں جو کچھ مل سکا اسے اپنے قبضہ میں کیا، اور پھر گودام کا رخ کیا، وہاں رکھے ہوئے سیماب کے کنستروں کو توڑا، اور تمام پارے کو فرش پر لنڈھا دیا، جمعرات کی سہ پہر لٹیرے انگریزوں کے خوف کے سبب سعید بیگ کے محل اور گودام سے بھاگ گئے،[51] اس غارت گری کی منظر کشی کرتے ہوئے "سورت میں مرہٹوں کے مظالم اور کشت و خون کے عنوان سے پروفیسر جدوناتھ سرکار رقم طراز ہیں کہ "اپنا چھپا ہوا مال و اسباب اور سرمایہ بتانے کے لیے لوگوں پر ظلم و زیادتی کرنے میں مرہٹوں نے کوئی دقیقہ نہ چھوڑا، انھیں کوڑوں سے پیٹا گیا، اور جان سے مارنے کی دھمکیاں دی گئیں، کسی کا ایک اور کسی کے دونوں ہاتھ کاٹ دیے گئے، اور بہت سے لوگوں کو جان سے مار ڈالا گیا، قیدیوں میں سے جو شخص مرہٹوں کو کچھ نہ دے سکا، اس کا کوئی نہ کوئی عضو قلم کر دینے یا اسے قتل کرنے کا حکم دیا گیا۔ سیواجی نے ہر ایک گھر سے جتنا مل سکا، اتنا مال لے لیا، اور پھر صاحب خانہ سے کہا کہ اگر مکان محفوظ رکھنا چاہتے ہو، تو کچھ اور پیش کرو، اپنا گھر بچانے کے لیے جب رہا سہا مال و متاع اور اثاثہ بھی سیواجی کو دے دیا گیا، تو اس نے اپنے وعدہ کی پروا کیے بغیر اسی وقت اس گھر کو بھی نذر آتش کر دیا، انھی ایام میں ایک بوڑھا تاجر آگرہ سے چالیس بیلوں پر کپڑے کے نئے تھان لاد کر لایا تھا، اس سے بھی رقم کا مطالبہ کیا گیا، مگر کپڑا نہ بکنے کے سبب وہ سیواجی کو نقد روپیہ نہ دے سکا، اور اپنا تمام اسباب دینا چاہا، جسے سیواجی نے قبول نہ کیا، اور روپیہ نہ دینے کے پاداش میں اس کا داہنا ہاتھ کاٹ دیا گیا، نیز تمام تھان جلا کر راکھ کر دیا گیا،[52] سیواجی کی فوج

[51] سیواجی اینڈ ہز ٹائمز۔ ص ۹۶-۱۰۰ [52] ایضاً ص ۹۹ نیز اسی تصنیف کا ہندی مفتی ایڈیشن ص ۵۳-۵۴

سپاہیوں نے تمام پارسیوں کو بھی لوٹ لیا، اور ان کے مکانات جلا دیے، پارسیوں میں سے جو قید کر لیے گئے تھے، انھیں رستم مانک جی نے دس ہزار روپیہ زرفدیہ دے کر سیواجی کے خونی پنجوں سے رہائی دلائی،[53] بہرحال چوتھے دن مغل فوج کی آمد کی خبر سن کر سیواجی سورت سے بقول پرتگالی مورخ کاسمیڈا گوآدہ لوٹ کے مال و اسباب کو نو سو بیلوں پر لاد کر اپنی راجدھانی سے راے گڈھ بھاگ گیا، اسمتھ جین ڈے تھیونوٹ لکھتا ہے کہ اس غارت گری میں تقریباً تین کروڑ کی مالیت سیواجی کے ہاتھ لگی،[54] لیکن حقیقت یہ ہے، کہ اس بے شمار مال غنیمت کو شمار کرنے کی اسے کبھی فرصت نہ مل سکی،[55] اس سنگدلانہ کارروائی کو سر جدوناتھ سرکار سیواجی کی زندگی کا عظیم ترین کارنامہ قرار دیتے ہیں، اور اس کی تمام ظالمانہ کارروائی سے اغماض برتتے ہوئے، نہایت معصومانہ انداز میں فرماتے ہیں کہ شہر (سورت) کے چار روزہ قیام میں سیواجی نے لوٹ مار اور غارت گری کرنے میں خاطر خواہ فائدہ اٹھایا، مگر دولت حاصل کرنے کے لیے بیجا ظلم و ستم اور سفاکانہ خون خرابہ سے گریز کیا،[56] گویا پروفیسر موصوف کے نزدیک سیواجی نے جو بھی ظلم و ستم اہل سورت پر ڈھائے، وہ ایک رحمدلانہ عمل تھا، ۳ اکتوبر ۱۶۷۰ء کو موقع پا کر سیواجی نے سورت کو دوسری دفعہ لوٹا، جس میں کم از کم چھیاسٹھ لاکھ روپے

[53] سیواجی اینڈ ہز ٹائمز ص ۱۰۲
[54] گرینٹ ڈف انڈیا۔ ص ۹۰-۸۸ [55] نیو ہسٹری آف دی مرہٹاز ص ۱۷۸، نیز سیواجی اینڈ ہز ٹائمز۔ ص ۹۸ [56] ایضاً ص ۹۷-۹۹

مرہٹوں کے ہاتھ لگے[۱]۔ اس مرتبہ بھی بڑے بڑے مکانات کو اپنی قزاقی کا نشانہ بنایا
اور تقریباً نصف شہر کو جلا کر خاکستر کر دیا، چھیاسٹھ لاکھ مال غنیمت میں ترپن لاکھ
زر نقد جواہرات اور قیمتی اسباب کی صورت میں تھا، باقی تیرہ لاکھ نول ساہو، سا ہو
ی ساہو . . . . ، اور سورت کے ایک مضافاتی قصبہ سے لوٹے
گئے تھے[۲]، سیواجی کے اس کارنامے کی تفصیل لذیذ بود حکایت دراز تر گفتیم کی
مصداق قدرے طویل ضرور ہو گئی ہے، لیکن اس تطویل سے ناظرین کرام
پہ یہ واضح ہو جائے گا کہ ہندو کش اور رافضی کش اورنگزیب تھا یا سیواجی۔
اگر اورنگ زیب کے امرار کی مجموعی تعداد کے پس منظر میں اس کی
راجپوت نوازی اور ہندو پروری کا جائزہ لیا جائے تو وہ اشوک واکبر بلکہ
آزاد ہندوستان کے حکمرانوں سے بھی زیادہ سیکولر نظریات کا حامل دکھائی
دے گا، یہ وہی تھا جس کے دور حکومت میں زمانہ ماقبل تاریخ سے ۱۶۵۰ء
تک کے ہندوستان کا سیاسی ہلال بدر کامل ہو گیا تھا، غزنی سے چاٹگام
اور کشمیر سے کرناٹک تک ہندوستان ایک ہی حکم کے تابع اور ایک ہی

---

۱ سیواجی اینڈ ہز ٹائمز۔ ص ۱۷۲ - ۱۷۴ - نیز نیو ہسٹری آف مرہٹاز ص ۲۳۹
۲ سیواجی اینڈ ہز ٹائمز۔ ص ۱۷۳ - ۱۷۴ - نیز نیو ہسٹری آف مرہٹاز ص ۲۳۹
سورت کی غارت گری کے سلسلہ میں مرہٹی زبان کے تاریخی لٹریچر میں سورت
کے ساتھ فخر و مباہات کے طور پر جا بجا "بے سورت" یعنی بدشکل کا استعمال کیا گیا
ہے۔ ہندی زبان میں سورت اور صورت کا املا یکساں ہوتا ہے، ملاحظہ ہو
نیو ہسٹری آف دی مرہٹاز ہندی اڈیشن۔ ص ۱۷۸ تا ۹۔

خطبہ کا سامع تھا، اور ۳۲ صوبوں کا نظم و نسق یکساں تھا، پوری مملکت
میں ایک ہی سکہ اور ایک ہی سرکاری زبان رائج تھی، کسی فرقہ کے عائلی
قوانین میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جاتی تھی، عدل و انصاف کی نظروں
میں ادنیٰ و اعلیٰ یکساں تھے، یہی وہ باتیں ہیں، جو کسی مملکت کو صحیح معنوں
میں ایک "راشٹر (قوم)" بنانے کے لیے ضروری ہیں، اورنگزیب نے اس
ملک کو ایک قوم اور ایک عظیم تر سیاسی اکائی میں متحد کرنے کا جو عظیم ترین
کارنامہ انجام دیا، اس کی حقیقت اس وقت واضح ہو گی، جب لوگ
متعصب تاریخ نویسوں کی الزام تراشیوں کو اچھی طرح سمجھ لیں گے۔

دور شو از بزم اے واعظ و افسانہ مگو
من نہ آنم کہ دگر گوش بہ تزویر کنم،

مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

(جلد سوم)

القول الجلی فی ذکر آثار الولی

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے مستند و مکمل سوانح کا بنیادی ماخذ

از
جناب مسعود انور علوی کاکوروی، استاد شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے مستند و مکمل سوانح ان کے خاندان داہل خاندان خلفاء و مجاز وغیرہ کے حالات، ان کے ارشادات افادات، واردات اور مکاشفات کا سب سے بنیادی اور اہم، جامع و وقیع ماخذ "القول الجلی" ہے۔ جس کو انکے حکم سے ان کے محبوب خلیفہ اور ماموں زاد بھائی، ان کے صاحب زادگان کے مربی و استاد ان کی اکثر و بیشتر تصانیف کے کاتب مولانا شاہ محمد عاشق صدیقی پھلتی[1] بن شیخ عبید اللہ صدیقی نے ۱۰ شعبان سنہ ۱۱۴۴ھ کو مقام رابغ میں ان کے حکم سے مرتب کرنا شروع کیا تھا، شاہ صاحب وقتاً فوقتاً بنظر اصلاح اُسے ملاحظہ فرماتے اور اس میں ترمیم و تنسیخ اور اضافہ فرماتے رہے، چنانچہ جامع ملفوظ نے سبب تالیف کے بعد جو خاص بات لکھی ہے، وہ یہ ہے کہ

"میں نے اس کتاب میں کوئی چیز ایسی نہیں لکھی جو آنجناب سے مکرر عرض نہ کر دی ہو، اور وہ شرف اصلاح سے مشرف نہ ہو گئی ہو، اسی طرح تیسری قسم میں جو جو حالات و واقعات جن جن حضرات کے تحریر کیے وہ پہلے آنجناب سے عرض کیے پھر تحریر کئے" ہر واقعہ کو لفظ افادہ سے معنون کیا، اور اس کا نام القول الجلی فی

[1] شاہ محمد عاشق پھلتی کے تفصیلی سوانح کے سلسلہ میں راقم حقر کا مقالہ ماہنامہ برہان اپریل ۱۹۸۳ء دہلی میں ملاحظہ فرمائیں۔

ذکر آثار الولی رکھا۔" (القول الجلی کتب خانہ انوریہ خانقاہ کاظمیہ۔ قلندریہ کاکوری۔ ص ۲)

حضرت شاہ صاحبؒ نے جہاں کہیں (الجزء اللطیف وغیرہ میں) اپنے بارے میں کچھ تحریر فرمایا ہے، تو اسی ملفوظ کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ میرے حالات و واردات اور مکاشفات وغیرہ کے بارے میں جس کسی کو بھی معلوم کرنا ہو وہ القول الجلی کا مطالعہ کرے، آنجناب کے اس جملہ سے ملفوظ کی اہمیت و افادیت اور سند متحقق ہو جاتی ہے۔

کہا جاتا ہے، کہ یہ اہم اور نادر ملفوظ ایک عرصہ سے نایاب تھا، حد یہ ہے، کہ "حیات ولی" کے مولف مولوی رحیم بخش دہلوی اور مولانا عبید اللہ سندھی جو حضرت شاہ صاحب کی فکر و تعلیمات کے بڑے عالم کہے جاتے ہیں، ان کو بھی باوجود تلاش بسیار کے اس کا کوئی مکمل و نامکمل نسخہ کہیں نہ دستیاب ہو سکا تھا۔

تذکرہ علمائے ہند کے مولف نے بھی اپنے تذکرہ کی فہرست ماخذ میں القول الجلی کا نام دیا ہے، جس سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ ان کی نظر سے یہ ملفوظ گزرا ہوگا۔ نواب صدیق حسن خاں قنوجی کے کتب خانہ میں اس کا نسخہ رہا ہوگا، کیوں کہ شاہ محمد اسحٰقؒ و شاہ محمد یعقوب کے سلسلہ میں شاہ صاحبؒ کی ایک بشارت کا ذکر کرنے کے بعد اظہار حیرت کیا ہے، نواب صاحب موصوف نے القول الجلی کی جو عبارت درج کی ہے، وہ بے کم و کاست کتب خانہ انوریہ کاکوری کے نسخہ میں موجود ہے۔

"در قول جلی از کلام ایشان آوردہ کہ فرمودند آگاہی آمد این فرزندان کہ لطف الٰہی ایشان را بما عطا کردہ است ہمہ سعدا اند نوعی از ملکیت در ایشان ظہور خواہد کرد لیکن تدبیر غیب تقاضا می کند کہ دو شخص دیگر پیدا شوند کہ در مکہ و مدینہ سالہا احیای علوم دین نمایند و ہماں جا وطن اختیار کنند از طرف مادر نسب ایشان بما متمکن باشد

زیرا کہ آدمی زادہ بوطن مادر میلان طبعی دارد وانتقال جماعہ کہ وطن والدہ ایشان
متکون باشند بسرزمینے بالطبع مستحیل ست مگر بقسر قاسر، انتہی بلفظہ[1]

محترم مولانا حافظ شاہ مجتبیٰ حیدر قلندر صاحب مدظلہ خانقاہ کاظمیہ قلندریہ کے ارشاد کے مطابق
کہ مولوی نور الحسن صاحب راشد کاندھلوی کی تحریر کی رو سے ۱۹۴۷ء تک ان کے کتب خانہ میں
قول جلی کا ایک نسخہ موجود تھا، پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی کے لکھنے کے
مطابق ایک ناقص نسخہ ان کے پاس بھی موجود ہے، پروفیسر موصوف کا نسخہ کس قدر ناقص ہے اور
کس سنہ کا لکھا ہوا ہے، اس کا علم راقم الحروف کو نہیں ہو سکا۔

ایک اور ناقص نسخہ خدا بخش لائبریری میں ہے، جس پر ہمارے فاضل محترم جناب فضیل احمد
صاحب قادری نے ماہ جون ۱۹۸۷ء کے معارف میں ایک مبسوط تعارفی مقالہ سپرد قلم فرمایا
ہے، موصوف نے راقم احقر کو پٹنہ کے دوران قیام وہ نسخہ دکھایا تھا، اس نے مخطوطہ کے مختلف
اوراق کے عکس بھی لیے تھے، اور جیسا کہ فضیل صاحب نے تحریر فرمایا یہ بھی عرض کیا تھا کہ چونکہ
کتب خانہ انوریہ میں موجود اس مکمل نسخہ کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے، اس کی بنیاد پر وثوق سے
کہہ سکتا ہے کہ کتب خانہ مذکورہ کے قسم ثانی وثالث اور نسخہ خدا بخش میں کہیں کہیں بجز بہت معمولی
سے کتابت کے فرق کے اور کوئی فرق نہیں، گویا ایک ہی کتاب کے دو نسخے ہیں، مگر اس کی وہ
اہمیت وافادیت نہیں ہے، اس لیے کہ اس کا بڑا حصہ (قسم اول) جو گویا اصل القول الجلی فی ذکر
آثار الولی ہے، اس سے غائب ہے۔ اور شاہ صاحبؒ کے حالات زندگی سے متعلق افسوس کہ
ایک سطر بھی نہیں ہے، لیکن اس ناقص نسخہ سے کتب خانہ انوریہ کے نسخہ کی پوری سند مل
جاتی ہے، اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے اصل و مکمل سوانح نسخہ

---

[1] اتحاف النبلاء۔ نواب صدیق حسن خان مطبع نظامی۔ کانپور ۱۲۹۸ھ ص ۴۳۱

کاکوری کے اب تک کہیں کسی جگہ دستیاب نہیں ہیں۔
قسم ثانی وثالث یقیناً اہم ہیں، اور اس میں موجود مواد کہیں اور دستیاب نہیں ہوتا ہے،
مگر بقول مولانا شاہ ابوالحسن علی ندوی قبلہ کے "عوام تو عوام اکثر خواص کے بس کا نہیں کہ شاہ
صاحب کے بعض دقیق مشاہدات و مکاشفات کی پوری تشریح و توضیح کر سکیں"، البتہ شاہ صاحب کے
سوانح ضرور ایسے ہیں کہ ان کو پڑھ کر ایک عام انسان بھی ان کی فکر اور مسلک و موقف کا
صحیح اندازہ کر سکتا ہے، قسم اول کے مطالعہ سے اس دور کی سماجی، سیاسی اور معاشی حالت
کا بخوبی پتہ چلتا ہے، القول الجلی شاہ صاحبؒ پر کام کرنے والوں کے لیے ایک سنگ میل کا درجہ
رکھتا ہے۔

ذیل میں نسخہ کاکوری جو دنیا میں واحد معلوم و مکمل نسخہ ہے، اس کا ایک تعارف درج ہے،
اس مخطوطہ میں کل ۹۴ صفحات ہیں، ہر صفحہ میں ۱۹ سطریں ہیں۔ خط درمیانی ہے خوشخط
نہیں ہے، سنہ کتابت ۱۲۳۹ھ ہے گویا حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی وفات سے بھی
دس سال قبل، ابتدائی صفحہ پر سعید الدولہ شریف الملک سید علی محمد خان بہادر انتظام جنگ
الحسینی الموسوی الیجاری کی مہر ہے، مہر پر ۱۲۶۱ھ درج ہے۔

ابتدا اس طرح ہے۔

الحمد لله الذی اصطفیٰ نوع	تمام تعریف اس اللہ کے لیے ہے
الانسان علی سائر الخلائق	جس نے بنی نوع انسان کو تمام مخلوقات
وفضلهم تفضیلا وخص	میں افضل بنا کر منتخب و برگزیدہ فرمایا
الاکمل منهم بمعرفة اسمائه	اور ان میں سے کاملین کو اپنے اسماء
وصفاته وصحبة کنهه	وصفات کی معرفت نیز حقیقت ذات کی

ذاتہ اجمالاً وتفصیلاً — محبت کے لیے مختصر و مفصل طور پر مخصوص
فاولئک من الانسان — فرمایا۔ وہ حضرات انسانوں میں انکی
کالعین اوالانسان من العین — آنکھ کے مثل شرف و بزرگی میں اہم ہیں، الخ
تشریفاً وتنویلاً۔ الخ

جامع ملفوظات سبب تالیف کے سلسلہ میں لکھتے ہیں :۔

"۱۱ شعبان ۱۱۴۴ھ کی شب کو مدینہ طیبہ سے مکہ معظمہ لوٹتے وقت رابغ کے مقام پر حضرت نے ارشاد فرمایا کہ "اگر کوئی (میرے ان بیان کردہ) ان حقائق و معارف کو جسے لوگ سمجھ سکیں قلم بند کرے تو وہ اس کے ضمن میں اسرار کو مندرج پائے گا، اور بڑے فوائد مشاہدہ کرے گا"۔ اس خاکسار نے اس حکم کے مطابق کہ تمھارے اوقات میں تمھارے پروردگار کے انفاس مبارکہ ہیں، تمھارے لیے اس کی تلاش و جستجو ضروری ہے، اس نفحۂ الٰہیہ کی تلاش کو ضروری سمجھا، اور اس نفس روحانی کو عظیم جانا، اس ضمن میں اس خاک پر ہر نفحہ وہاب منعام علمی مفتوح ہوا، چنانچہ اسی وقت اس میں سے قدرے مقدمہ لکھا، جو اس جلیل القدر کام کے لیے عزم مصمم اور تمہید ہو گیا، اور پندرہویں تاریخ ماہ مذکور مکہ معظمہ میں اس کام کی ابتدا ہوئی"۔

حاشیہ کتاب پر بعض مطالب کی نشاندہی سرخ روشنائی سے کی گئی ہے، قیاس یہ ہے کہ بعد میں کسی صاحب نے اپنی سہولت کے خیال سے ایسا کیا ہوگا، ورنہ ان مطالب کے علاوہ بھی بکثرت مطالب ہیں، جن سے شاہ صاحب کے سلسلہ میں بڑی اہم و مفید اور عجیب و غریب دلچسپ معلومات فراہم ہوتی ہیں۔

چند مطالب جن کی نشاندہی حاشیہ پر ہے۔ وہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ تاریخ مولف، ۲۔ نام کتاب، ۳۔ خواب والد شاہ ولی اللہ مخبر از لیاقت بو[ات]،

(۴) ذکر قوت کاشفہ شاہ ولی اللہ بہ عالم صبا، (۵) ظہور خرق عادت بہ ایام صبا، (۶) مشاہدہ جنت بہ ایام صبا، (۷) از اینجا مستفاد است کہ شاہ صاحب و اسلاف ایشاں شافعی بودہ اند (۸) جواب عجیب، (۹) وحدت وجود، (۱۰) بخواب دیدن جناب امیر خیبر گیر، (۱۱) رد قضا از دعا، (۱۲) عزیمت دوبارہ بسفر حجاز، (۱۳) ذکر مخالفت شیخ عبد القادر جیلانی با ابو حنیفہ کوفی، (۱۴) بخواب دیدن جناب حسنین را، (۱۵) زیارت جناب رسالتمآب صلعم بچشم ظاہر، (۱۶) فضیلت ابا ذر غفاری رضی، (۱۷) برابر بودن مذاہب اربعہ ائمہ اہلسنت نزد صاحب الشریعت (۱۸) زیارت آنحضرت صلعم بچشم سر، (۱۹) مشاہدہ صراط، (۲۰) اتحاد ذاتی باآں حضرت صلعم، (۲۱) نزول جبرئیل و مکالمہ، (۲۲) ظہور ملائکہ، (۲۳) مشاہدہ آنحضرت صلعم بدون خواب، (۲۴) دیدن آنحضرت صلعم بہ عالم رویا و بیعت بہ طرز فقرا، (۲۵) ذکر ایام عاشورا و حضوری ارواح شہدا و دعوت طلب کردن شان رفاتحہ، (۲۶) مشاہدہ ملائکہ و ارواح، (۲۷) ذکر نادر شاہ و آفات دیگر، (۲۸) ذکر شیعہ و امام، (۲۹) ذکر جناب امیر رض، (۳۰) دعائے بقائے نسل، (۳۱) مذہب اثنا عشریہ، (۳۲) بیان حقیقت تجلی واجب تعالیٰ شانہٗ، (۳۳) ذکر نقشبندیہ (۳۴) ذکر جنت ارضی در بلاد جنوبی از جزائر ہندوستان، (۳۵) بیان مقصود بالذات، (۳۶) دعائے شب قدر، (۳۷) بیان فرزندان شاہ ولی اللہ (۳۸) تاریخ وصال، (۳۹) رباعیات خواجہ محمد امین، ۴۰۔ بیان نسبت پنجگانہ، (۴۱) افادہ در مقدمہ پیرا با مریداں و مریداں با پیران چہ تواند کرد، (۴۲) فصل وصیت نامہ خواجہ محمد امین، (۴۳) ذکر اعتقادی باصحابہ و بضمن آن ذکر مذہب شیعہ اثنا عشریہ، (۴۴) افادہ در مقدمہ توحید وجود و شہودی، ۴۵۔ ذکر قلیل از احوال فضائل اشتمال، (۴۶) ذکر بعضے احوال کرامت اشتمال و کلمات معرفت سمات، (۴۷) ذکر پارہ از فضائل بعضے اصحاب (۴۸) ذکر قدرے

از فضائل وجلائل۔

نمبر ۴۰ ذکر بعضے احوال کرامت الخ قسم ثانی میں ہے، قسم ثانی کی ابتدا اس طرح ہے:

قسم ثانی در بارہ کلمات ارشادسات، باید دانست کہ کلمات قدسیہ الخ قارئین مندرجہ بالا عنوانات

مطالب سے قسم اول کی اہمیت و افادیت کا اندازہ کر سکتے ہیں،

اسی ملفوظ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب رح کی والدہ ماجدہ کا نام نامی فخر النساء تھا، مولف نے ان کی ولادت سے قبل ان کی والدہ محترمہ کو ہونے والی مختلف بشارات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "وہ بروز چہارشنبہ ۴ شوال ۱۱۱۴ھ بوقت طلوع آفتاب متولد ہوئے۔ منجموں اور ستارہ شناسوں نے علم نجوم کی رو سے یہ کہا ہے کہ آپ کی ولادت کے وقت حوت کا درجہ دوم طالع میں تھا، اور شمس بھی اسی درجہ میں تھا، زہرہ اٹھویں عطارد اکیسویں، زحل دسویں اور حمل و مشتری پندرہویں درجہ میں تھے، اور وہ سال علویین کے قران کا سال تھا، اور وہ درجہ اولیٰ میں تھا، مریخ اس سے دوسرے درجہ میں تھا، اور راس سرطان میں تھا۔" (یہاں تک کی عبارت حضرت شاہ صاحب کے رسالہ "الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف" میں من وعن درج ہے) منجملہ کرامات کے یہ بھی ہے کہ اہل تنجیم کی رو سے جس سیارۂ فلکی میں ان کی ولادت ہوئی، اسی میں حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی کہ شمس و عطارد برج حوت میں تھے، اور یقیناً یہی وجہ ہو کہ آپ وارث کمال نبوت ہوئے۔"

جامع ملفوظ نے ان کے بچپن کے بہت سے ایسے واقعات و بشارات درج کئے ہیں، جن سے ان کی ولایت و ملکوتی صفات پر روشنی پڑتی ہے۔" ان کی ذہانت و عبقریت کے سلسلہ میں بچپن کا ایک چھوٹا سا واقعہ درج ہے۔ "ایک مرتبہ حضرت شیخ بزرگ قدس سرہ

(شاہ عبد الرحیم) کی مجلس میں مشہور رباعی۔

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن	دل بدست دگرے دادن و حیران بودن
سوئے زلفش نگہ کردن و در رویش دیدن	گاہ کافر شدن و گاہ مسلماں بودن

... پڑھی جا رہی تھی، اور اس کے معانی پر غور ہو رہا تھا کہ انھوں نے فرمایا کہ مصرع اول کے معنی یہ ہیں کہ اسلام وجہ عبادت حقیقی ہے، اور اپنے کو بغیر کسی لطیفہ وجہت کی مخالفت کے اللہ تعالیٰ کے لیے صرف کر دینا ہے، اور مصرع دوم میں حضرت حق تعالیٰ کے ساتھ دوام توجہ کا اشارہ ہے جو آداب طریقت کا مغز ہے، اور مصرع سوم میں یہ مطلب ہے کہ جلال و جمال کی تجلیات کا مشاہدہ بھی نہ ہو یعنی تنزیہ محض اور چہارم میں اس کی تاثیر کا لطیفہ انسانیہ میں موثر ہو جانا مراد ہے"، جب انھوں نے یہ بیان فرمایا تو سامعین ششدر رہ گئے۔

جامع ملفوظ نے ان کے پہلے سفر حج کا بھی مفصل و ایمان افروز حال لکھا ہے، حالانکہ انکے تمام سوانح نگار اس سلسلہ میں بالکل خاموش ہیں، یہ سفر انھوں نے ۱۱۳۲ھ میں شروع کیا تھا، مگر کھمبات سے حسب ارشاد نبویؐ واپس تشریف لے آئے، حضرت شاہ صاحب نے اپنے اس ارادہ کو اتنا مخفی رکھا تھا، کہ قریبی اعزہ تو اعزہ گھر والے بھی واقف نہ تھے مگر جامع ملفوظ اس تمام سفر میں بھی ہمراہ و ہمرکاب ہے، چنانچہ ان کے چشم دید بیانات پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

ملفوظ کے مطالعہ سے ان کی بے پناہ سیاسی بصیرت اور سیاسی جدوجہد کی حقیقی نوعیت پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے، سیاسی حالات سے متعلق بھی انکی تمام پیشین گوئیاں سچ ثابت ہوئیں۔

مثلاً صرف دو واقعات درج ہیں، ایک روز ارشاد فرمایا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آگ کا ایک دریا امنڈتا آرہا ہے، بڑے بڑے حادثات پیش آنے کے آثار نظر آرہے ہیں اور

"آباد بستیاں مثل دیہات وقصبات برباد وتباہ ہوجائیں گی، دیہات وقصبات وغیرہ ویران جنگلوں کی طرح ہوجائیں گے اور ایسے مصائب رونما ہوں گے کہ ارکان سلطنت بھی انکا ازالہ کرسکیں گے ان کا ازالہ صرف صاحب دلوں کی ہمت پر ہوگا، ایسا نظر آتا ہے کہ شہر دہلی جو پایۂ تخت ہے، وہاں ہر جگہ سے زیادہ آفت ومصیبت ہے۔"

سنہ ۱۱۴۳ھ شروع ہوتے ہی فرمانے لگے کہ "مصائب کا وقت آہی چکا ہے" اسی زمانہ میں اتنی شدید بارش ہوئی کہ "قصور مشیدہ" بھی ڈھ گئے، غنیم دکھنی نے اسی زمانہ میں حملہ کیا، حالانکہ شاہی افواج موجود تھیں، مگر وہ دہلی کے پاس پہنچ گیا، اور اس کو تاراج کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ دریا کے کنارے دونوں افواج کا مقابلہ ہوا طرفین کے بہت سے آدمی مقتول ہوئے، اور بڑی تباہی کے بعد اس آفت سے چھٹکارہ ملا بعض مخصوصین نے عرض کیا کہ جس آفت کا خطرہ تھا وہ گزر گئی؟ فرمایا "وہ آفت تو آنے والی ہے" اسی زمانہ میں ایک روز ان کے خلیفہ شاہ نور اللہ بڈھانوی شاہ جہان آباد (دہلی) کے سوق سلطانی میں کچھ خریدنے کے لیے گئے، واپسی پر شاہ صاحب نے استفسار فرمایا۔ بازار والوں کا کیا حال دیکھا۔

انھوں نے عرض کیا کہ بالفعل وہ سب محفوظ ہیں لیکن ایک وحشت سی نظر آتی ہے، یہ سن کر فرمایا

"یہ بازار بزبان حال کہہ رہے ہیں کہ یہاں خون کی نہریں بہیں گی"

یہ خبر وحشت اثر سن کر ایک عام اضطراب وبے چینی پیدا ہوگئی، پیشین گوئی پوری ہونا تھی، تقریباً سال بھر بعد ہی نادر شاہ نے حملہ کیا، اور دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی، وہ قصبوں اور شہروں کو تباہ کرتا ہوا کرنال پہنچا وہاں محمد شاہ نے مقابلہ کیا، اس تمام عرصہ میں حضرت شاہ صاحب لوگوں کے عرض کرنے پر یہی فرماتے رہے کہ محمد شاہ اپنی جگہ پر ہی رہے گا۔

دہلی میں داخلے کے تیسرے روز ہی نادر شاہ نے قتل عام کا حکم دیدیا، اس کے سپاہیوں کا یہ عالم تھا کہ بقول جامع ملفوظ۔

جس جاندار کو خواہ وہ انسان ہوتا یا حیوان پاتے قتل کردیتے یہاں تک کہ کتے بلی کو بھی نہ چھوڑا، اور شہر کے بازاروں ومکانوں کو آگ لگادی مقتولین کے پشتے پر پشتے لگ گئے۔

اور وہی ہوا جس کی پیشین گوئی شاہ صاحب فرما چکے تھے کہ

بازاروں میں خاص طور پر سوق سلطانی جو چاندنی چوک کہلاتا ہے، خون کی ندیاں بہہ گئیں۔

اس قتل وغارت گری کے اندوہناک وروح فرسا کھیل کے بعد کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ اب کبھی دہلی کے تخت پر کوئی تیموری حکمراں بیٹھ سکے گا لیکن تاریخ شاہد ہے کہ حضرت شاہ صاحب کا ارشاد صحیح ثابت ہوا، اور حملہ آور تمام خزائن ودفائن جدیدہ وقدیمہ اور زر وجواہر لے کر واپس چلا گیا، اور محمد شاہ کو تخت پر بٹھا گیا۔

جامع ملفوظ نے احمد شاہ ابدالی کے حملوں کا بھی ذکر کیا ہے، اور اس سلسلہ میں حضرت شاہ صاحب کے موقف کو لکھا ہے، معرکۂ بالاکوٹ جو شاہ صاحب کے وصال کے ایک طویل عرصہ بعد ہوا، اس کے متعلق بھی واضح ارشادات قول جلی میں مذکور ہیں، شاہ صاحب کے سیاسی مکتوبات کی تصدیق جامع ملفوظ سے پوری طرح ہوجاتی ہے،

جامع ملفوظ نے شاہ صاحب کے وصال کا بھی محیر العقول واقعہ درج فرمایا ہے۔ اس کے علاوہ بکثرت تاریخیں اور آپ کے مخلص خلفاء ومریدین کے درد انگیز خزینہ اشعار اور مراثی درج ہیں، ایک عرصہ تک شاہ صاحب کے سنہ وفات میں

اختلاف رہا تھا، "حیات ولی" کے مولف کو ایک مصرع "او بود امام اعظم دین" مل سکا تھا۔ جسے وہ اور ان کے بعد کے تمام سوانح نگار نقل کرتے چلے آئے۔ "القول الجلی" کے مذکورہ نسخہ میں بکثرت مادہ ہائے تاریخ آفتاب دیں شد زیر زمیں او بود امام اعظم دین، آں ولی نقشبند ثانی بود، جنید عصر بوقت از جہاں ندا فرمود وغیرہ ہیں۔

مولف کتاب نے ان کے واقعۂ وصال کے ضمن میں حضرت مرزا مظہر جان جاناں کا مع احباب خاص عیادت کے لیے آنا انکی آمد پر تخلیہ کرنے اور دونوں صاحبان اور چند مخصوصین کے مراقب ہونے کا حال بھی لکھا ہے، اس بیان سے دونوں کے باہم روابط پر مزید روشنی پڑتی ہے۔

"شنبہ ۲۵ محرم ۱۱۷۶ھ کو جب کہ حضرت اقدس کی عمر شریف کا باسٹھواں سال شروع ہوا تھا، حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ جو سلسلۂ نقشبندیہ احمدیہ کے مشہور مشائخ میں سے ہیں، مع اپنے احباب کے عیادت کو آئے۔ ان کی آمد پر تخلیہ کرایا گیا۔ اور بجز چند مخصوصین کے جن کا طفیلی یہ غلام (جامع ملفوظ) بھی تھا، کوئی اور نہ رہا پھر حلقۂ مراقبہ ہوا، اور نصف گھنٹہ صحبت گرم رہی جب مجلس مراقبہ ختم ہوئی۔ اور مرزا صاحبؒ نے رخصت چاہی تو اسی وقت مزاج شریف متغیر ہو گیا۔ اور آناً فاناً آثار وصال ظاہر ہوئے۔ اور اسی روز وقت ظہر طائر روح پاک نے عالم قدس کی جانب پرواز کی اور رفیق اعلیٰ سے واصل ہو گیا۔"[1]

---

[1] القول الجلی ص ۲۷۳

مطبوعات جدیدہ

خَلقُ الانسان فی اللغة :- تالیف ابو محمد حسن بن احمد بن عبد الرحمن تحقیق و تقدیم ڈاکٹر احمد خان، تقطیع متوسط، کاغذ و طباعت عمدہ، صفحات ۵۰۴، قیمت درج نہیں، منشورات معہد المخطوطات العربیہ، المنظمة العربية للتربية والثقافة والعلوم، صندوق البرید ۲۶۸۹۷ - الرمز البریدی ۱۳۱۲۹، صفاة ۔ کویت۔

یہ عربی لغت کی ایک نادر و نایاب کتاب ہے، جس کی دریافت کا سہرا ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد کے رفیق ڈاکٹر احمد خان کے سر ہے، ان کو امام صغانی کی کتابوں کی تلاش و جستجو کے سلسلہ میں اس کا ایک قلمی نسخہ اتفاقاً استنبول کے ایک کتب خانہ میں ملا، یہ امام صغانی ہی کی کتابوں کے ساتھ درج تھی، اس کی وجہ سے بروکلمن وغیرہ نے سہواً اسے بھی صغانی ہی کی کتاب سمجھ لیا، مگر ڈاکٹر احمد خان کو از اول تا آخر کتاب کا مطالعہ کرنے اور دوسرے قرائن و شواہد سے پتہ چلا کہ یہ صغانی کے بجائے ابو محمد حسن بن احمد بن عبد الرحمن کی تصنیف ہے، اس کی اہمیت و قدامت اور عربی لغت کی مفید اور انوکھی کتاب ہونے کی وجہ سے انھوں نے اسکو ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے، جس کے لیے وہ اہل علم کے شکریے کے مستحق ہیں۔

اصل کتاب میں انسانی جسم کے بیرونی و اندرونی اعضا کے لیے عربی میں رائج الفاظ نقل کر کے ان کے معنی تحریر کئے گئے ہیں، جسمانی اعضا کے ساتھ جسم کے متعلقات جیسے خون اور بال وغیرہ کے لیے مروج الفاظ کے معنی بھی دئے گئے ہیں، غرض جو اشیاء و اعضا مشترک

طور پر تمام افراد انسانی میں پائے جاتے ہیں، ان سب کا اس میں ذکر ہے، البتہ جو اوصاف و عوارض بعض افراد ہی میں ہوتے ہیں، جیسے لمبائی، کوتاہ قامتی یا اندھا، اور لنگڑا ہونا وغیرہ اس کے لیے عربی میں بولے جانے والے لفظوں کے معنی نہیں لکھے ہیں مصنف نے پہلے ان اعضا کا ذکر کیا ہے، جو مردوں اور عورتوں میں مشترک طور پر موجود ہیں، پھر صرف مردوں میں اور آخر میں محض عورتوں میں پائے جانے والے اعضا وغیرہ کے معنی درج کئے ہیں، الفاظ کی تذکیر و تانیث، واحد و جمع اور حرکت و اعراب کی بھی تشریح و وضاحت کی ہے، شرح و توضیح میں آیات قرآنی، احادیث نبوی اور شعرائے عرب کے کلام سے شواہد بھی پیش کیے ہیں مشہور و قدیم ائمہ لغت کی کتابوں سے مدد لینے کے علاوہ انھوں نے کہیں کہیں مشہور یونانی حکیم جالینوس کے خیالات بھی نقل کیے ہیں، یہ کتاب حروف معجم کی ترتیب کے مطابق ہے، لیکن اس میں قارئین کی سہولت کے خیال سے اصلی اور زائد حروف میں کوئی تفریق نہیں کی ہے، اس لیے جو لفظ بھی الف سے شروع ہوتا ہے، پہلے اس کو دیا ہے، خواہ اس کا مادہ کچھ ہو، اس کی وجہ سے جملہ اعضا کے اسما ایک باب میں ہونے کے بجائے مختلف ابواب میں درج ہیں۔

کتاب لائق مرتب کے مفید مقدمہ و حواشی سے بھی مزین ہے، مقدمہ میں اس موضوع کی متعدد عربی کتابوں اور ان کے مصنفین کا نام، زیر نظر کتاب کی اہمیت، مقصد تالیف، طریقۂ تصنیف اور اس موضوع کی بعض اہم کتابوں سے اس کا تقابلی مطالعہ کیا ہے، نیز اس کے قلمی نسخہ کے حصول کی روداد، مخطوطہ کی نوعیت، کیفیت اور خصوصیت پر گفتگو اور اس کو ایڈٹ کرنے کے اپنے انداز کا ذکر کیا ہے، مصنف کے حالات کسی اور کتاب میں نہ ملنے کی وجہ سے مقدمہ میں ان کے عہد و زمانہ کا تعین بعض قرائن سے کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ان کے نام کا پتہ

کتاب کے خاتمہ سے لگایا ہے، اور مختلف شواہد سے ان کی جانب اس کتاب کی نسبت کو صحیح قرار دیا ہے معہد المخطوطات العربیہ کویت کا خاص مقصد قدیم اور نایاب مخطوطات کی اشاعت ہے، یہ کتاب بھی وہیں سے بڑے اہتمام اور نفاست کے ساتھ شائع ہوئی ہے، لائق مرتب نے آخر میں کئی فہرستیں بھی دی ہیں، جن میں کتاب کے ابواب کے علاوہ آیات، احادیث، اشعار و امثال کی تخریج کی ہے، اور اشخاص و کتب کے ناموں کے اشاریئے بھی دیے ہیں۔

قومی تعمیر کی دستاویز:- مرتبہ ڈاکٹر عبد الاحد صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۳۵ مع خوبصورت پلاسٹک کور، قیمت ۳۰ روپیے - پتہ (۱) وحدتِ انسانیت فاؤنڈیشن، پوسٹ بکس نمبر ۶۸۴۴ بنگلور ۲، (۲) انجمن ترقی اردو (ہند)، راؤز ایونیو۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ -

لائق مصنف نے ۱۹۶۹ء میں "اردو ادب اور قومی اتحاد" کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی تھی، اب طویل عرصہ کے بعد اسے کافی ردو بدل کے بعد نئے عنوان سے کتابی صورت میں شائع کیا ہے، اس میں اتحاد و یکجہتی کا مفہوم اور قومی سالمیت و وحدت کی اہمیت واضح کر کے ملک میں یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی پیدا کرنے کے صحیح طریقہ کار کی نشاندہی کی ہے اور اس سلسلہ میں اردو زبان و ادب کی گذشتہ اور موجودہ خدمات کی تفصیل پیش کی گئی ہے، یہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں اردو کے وجود میں آنے سے قبل کے حالات قدیم ہندوستانی سماج کی خصوصیات اور مختلف تہذیبی عناصر پر پڑنے والے اس کے اثرات کا جائزہ لیکر دکھایا ہے کہ اس دور میں مذہبی، تہذیبی اور سیاسی حیثیت سے ملک بحران سے دوچار تھا، مسلمانوں نے آکر اس کو اپنا وطن بنایا، علمی، فکری، تہذیبی اور تعمیری حیثیت سے بنا اور سنوار کر اس سے وفاداری کا حق ادا کیا، قدیم باشندوں سے رواداری اور اخوت کا

برتاؤ کر کے وحدت و یکجہتی کے جذبات کو فروغ دیا، پھر ان کے اور قدیم باشندوں کے اختلاط
سے ایک مشترکہ کلچر وجود میں آیا، دوسرے باب میں اس ماحول اور فضا میں اردو کے جنم لینے اور
اس سے یہاں کی تمام قوموں کے یکساں دلچسپی لینے، اس کے تہذیبی و معاشرتی انداز، اس کے
ہندوستانی مزاج و خصوصیت اور اس کی وحدت و اتحاد پسندی پر گفتگو کی ہے، تیسرے باب میں
ملک کی تہذیب پر اردو کے اثرات اور یکجہتی کا مفہوم بتایا ہے، اس میں اردو کے سیاسی و سماجی
شعور اور اردو ادب پر ۱۸۵۷ء کے اثرات کا جائزہ بھی لیا ہے، اس ضمن میں اردو شاعری کی ایک
خاص صنفِ سخن "شہر آشوب" کے علاوہ دوسرے اصناف سے بھی وحدت و ہم آہنگی کو فروغ دینے
والے اشعار نقل کئے ہیں، مختلف تہوار، میلے ٹھیلے، نہان اور پنگھٹ، رسم و رواج اور موسم کا
تذکرہ کر کے اردو شعر و ادب میں ہندوستانی عناصر، ملک کی دوسری زبانوں کی خصوصیات
اور ان کے الفاظ و خیالات اور علامات و انداز وغیرہ کو اپنا لینے کا ذکر بھی کیا ہے، چوتھے باب میں
پہلے اردو ادب و شاعری پر بعض تحریکوں دلی الہی، علی گڑھ اور ترقی پسند کے اثرات کا جائزہ لیا ہے،
اور سرسید کے مشن پر متوازن انداز میں تبصرہ کیا ہے، پھر جدید تصور قومیت کی وضاحت کر کے
عالمگیر قومیت کی تعمیر میں اردو کا حصہ دکھانے کے لیے ڈاکٹر اقبال کے افکار و خیالات کی روشنی میں
بحث کی ہے، پانچویں باب میں موجودہ دور میں یکجہتی کے بعض محرکات کی حقیقت و نوعیت کا ذکر
کر کے حب الوطنی کے محرک کو فروغ دینے اور جدوجہد آزادی میں اردو شعرا کی کوششوں کا جائزہ لیا ہے،
پھر آزادی کے بعد ملک کی مکدر فضا کو ختم کرنے میں اردو کا حصہ دکھایا ہے، اس ضمن میں ہندو مسلم
اتحاد اور صحیح تاریخ نگاری کی اہمیت واضح کی ہے، اور تفرقہ اندازی اور غلط تاریخ نویسی کا نقصان
بتایا ہے، کتاب کے آخر میں مصنف نے قومی یکجہتی پر اپنا ایک مفید مقالہ بھی دیا ہے، اس میں قومی
یکجہتی کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیکر پہلے تو اس خطرناک صورت حال کا تذکرہ کیا ہے، جس میں یہ مسئلہ

اس وقت گھرا ہوا ہے، ان کے خیال میں اس کو حل کرنے کے لیے جو کوشش ہو رہی ہیں وہ ناکافی ہونے
کے علاوہ محض سیاسی نعرہ بازی ہیں، پھر قومی سالمیت کی ضرورت اور صحیح نوعیت بیان کر کے
وحدت آدم کے تصور، احترام آدمیت، اخوت اور دلوں کے ملنے اور جڑنے کو اس کی اصلی بنیاد
بتایا ہے، اس سلسلہ میں سماج کے ہر طبقہ افراد و جماعتوں، حکومت، انتظامیہ اور اقلیت و اکثریت کی ذمہ داری بھی واضح کی
ہے، اس کتاب میں جا بجا مذہب کے یکجہتی کے خلاف ہونے کی تردید کی گئی ہے اور اس خصوصیت سے اسلام کی اس تعلیم و ہدایت
کا بھی ذکر کیا ہے جس میں اتحاد و یکجہتی کو فروغ دینے اور ملک و قوم کی تعمیر و ترقی میں حصہ لینے کی تاکید کی گئی ہے، مصنف نے
مختلف تہذیبی اکائیوں یا انفرادیتوں کو ختم کر کے یک رنگی و یکسانی پیدا کرنے اور سب کو کسی ایک ہی میں ضم
کر دینے کو سخت ضرر رساں بتایا ہے، ان کے نزدیک طبعی و ذہنی اختلافات سے مفر نہیں اور
جس قسم کی برابری و مساوات پر بعض قومی رہنما زور دیتے ہیں، وہ ان کے خیال میں غیر فطری ہے،
. . . . یہ موضوع بڑا نازک ہے، مصنف پکے مسلمان اور سچے محب وطن ہیں۔
اس لیے انھوں نے دونوں کے حدود الگ الگ رکھے ہیں. اور ان کی تحریر اور خیالات میں
بڑا اعتدال ہے، البتہ کسی علمی و تحقیقی کتاب کا یہ انداز غیر مناسب ہے کہ "بقول شخصے" "ایک دانشور
نے صحیح کہا تھا" "ایک مبصر کا یہ تبصرہ" "ایک مبصر کے قول کے مطابق" "ایک ادیب کے الفاظ
ہیں" "ہمارے ایک دردمند دانشور نے" "ایک ادیب کی دردمندی کا نمونہ ملاحظہ ہو" وغیرہ
ایسے موقع پر اولاً تو ادیب و مبصر کا نام لکھنا چاہئے تھا، ثانیاً اقتباسات کے ماخذ کی صراحت
کرنی چاہئے تھی، جن شعرا کے کلام نمونۃً نقل کئے ہیں ان کی کتابوں کے حوالے بھی نہیں دیے گئے ہیں،
بعض مشہور اقوال بھی بلا حوالہ درج ہیں، جیسے ص ۱۰۰ کے حاشیہ پر مسدس حالی کے متعلق سرسید کا
ایک قول گو بہت مشہور ہے، مگر اس کی ماخذ کا ذکر نہیں کیا ہے، اردو کی کسی علمی و تحقیقی کتاب میں
بلا ضرورت ہندی الفاظ سرل، پنر جنم اور انگ وغیرہ کا استعمال معیوب ہی سمجھا جائے گا، ص ۱۵۶ پر

حضرت سید احمد شہیدؒ کو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے خاندان کا ایک فرد لکھا ہے، جو تعجب انگیز ہے۔

اقوال سلف حصہ اول: مرتبہ جناب مولوی قمر الزماں صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۸۸، قیمت ۲۱ روپیے، پتے (۱) مکتبہ عزیزیہ، ۔۔۔ بخشی بازار الہ آباد (۲) مکتبہ افضل للمعارف، وصی آباد، الہ آباد۔

مولانا قمر الزماں صاحب کو اس دور کے دو اکابر شیوخ طریقت مولانا وصی اللہ فتح پوری اور مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڑھی کی خدمت میں رہنے اور ان سے رشد و ہدایت حاصل کرنے کا موقع ملا ہے، اس لئے وہ تصوف کے لذت آشنا اور صوفیہ و مشائخ کے دلدادہ ہیں، یہ کتاب صوفیہ و بزرگان دین سے ان کی عقیدت و شیفتگی کا مظہر ہے، اس میں انھوں نے حضرت شیخ عبد الوہاب شعرانی کی کتاب "الطبقات الکبریٰ" سے اولیاء و صلحا کے ارشادات و ملفوظات جمع کرکے ان کا اردو ترجمہ شائع کیا ہے، کہیں کہیں بعض اقوال کی مختصر تشریح بھی کی ہے، اس طرح یہ کتاب اصلاً تو امام شعرانی کی کتاب کا خلاصہ و انتخاب ہے، مگر لائق مرتب نے اس میں بعض دوسری کتابوں کی مدد سے کئی اور بزرگوں کے اقوال و ارشادات بھی اکٹھا کر دئے ہیں، اس کا آغاز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاکیزہ کلمات سے کیا ہے، اس میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے مجموعہ چہل حدیث کو اردو ترجمہ کے ساتھ نقل کیا ہے، اس کے بعد خلفائے راشدین اور دوسرے صحابہ، صحابیات اور تابعین کے ارشادات جمع کئے ہیں، پھر طبقہ بطبقہ تیسری صدی ہجری کے اختتام تک کے اقوال پیش کئے ہیں، یہ اس کتاب کا پہلا حصہ ہے، دوسرے حصوں میں بعد کی صدیوں کے مشائخ کے ارشادات پیش کئے جائیں گے، شروع میں تصوف کے متعلق بعض مفید باتیں اور اولیاء و صلحا کے فضائل بھی تحریر کئے ہیں، یہ پاکیزہ اور دلآویز ارشادات

"حکمت و معرفت پر مشتمل اقوال موثر اور روح پرور ہیں، جن کو پڑھنے میں لذت و کیفیت ملتی ہے۔

امت مسلمہ کے اجماعی مسائل: تالیف امام ابوبکر ابن المنذر نیشاپوری، ترجمہ و توضیح جناب ابو القاسم عبد العظیم صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۷۰، پتہ ہما فوٹو اسٹیٹ، مرزا ہادی پورہ، مئو ناتھ بھنجن، یو۔پی۔

امام ابوبکر ابن المنذر تیسری صدی ہجری کے عالم و مصنف تھے، انھوں نے کتاب الاجماع کے نام سے ایک رسالہ تحریر کیا تھا، جس میں صرف وہ فقہی امور و مسائل درج ہیں، جن پر امت کے سواد اعظم اور قابل ذکر طبقہ کا اجماع ہے، اور جن کے بارہ میں جمہور فقہا و محدثین سے کوئی اختلاف منقول نہیں ہے، کتاب کی ترتیب احادیث کے مجموعہ سنن یا عام فقہی کتابوں کے انداز پر کی گئی ہے، اور اس میں کم و بیش تمام فقہی ابواب زیر بحث آگئے ہیں، قدماء کی دوسری اہم کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی نادر الوجود تھی، اس زمانہ میں قدیم ورثہ اور اسلاف کی کتابوں کو منظر عام پر لانے کی جو سعی بلیغ ہو رہی ہے، اس کے نتیجہ میں حال ہی میں اس کتاب کے بھی چند اڈیشن نکلے ہیں، علمائے اسلام نے اس طرز و نوعیت کی کم کتابیں لکھی ہیں، اور جو لکھی ہیں وہ تقریباً ناپید ہیں، اس لحاظ سے اس کتاب اور اس کے اردو ترجمہ کی اشاعت ایک مفید علمی و دینی خدمت ہے، مترجم نے کہیں کہیں مفید حواشی بھی تحریر کئے ہیں، مگر ترجمہ کا کام بعض حیثیتوں سے تصنیف سے زیادہ مشکل ہے، اس لیے دوسرے اڈیشن میں ترجمہ کی صفائی اور روانی پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

قتل اسلام کے آئینہ میں: مرتبہ جناب ابو القاسم عبد العظیم صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۹۲، قیمت ۶ روپے، پتہ سابق

یہ رسالہ ابو القاسم عبد العظیم صاحب کی طبعزاد تصنیف ہے، اس میں کتاب و سنت کی

روشنی میں، ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان کو قتل کرنے کی مذمت و شناعت بیان کی گئی ہے، اس سلسلہ میں قتل کی مختلف نوعیتوں کو بیان کرکے شریعت محمدی میں مذکور، ان کی اخروی و دنیوی سزاؤں کی تفصیل قلمبند کی ہے، موجودہ زمانہ میں مسلمانوں میں باہم قتل و خوں ریزی بہت عام ہے، یہ کتاب اسی دردناک صورت حال سے متاثر ہوکر لکھی گئی ہے، خدا کرے یہ دردمندانہ تحریر مسلم معاشرہ کی اصلاح کا باعث بنے۔

ایک معلم کی ڈائری :- مرتبہ جناب بشر علی صدیقی صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۲۰، قیمت ۱۵ روپے۔ پتہ سکریٹری سلیم بشر اردو سوسائٹی، گلی وحید بخش، محلہ سوتھا، بدایوں۔

جناب بشر علی صدیقی بڑھاپے اور معذوری کے باوجود نوجوانوں سے زیادہ محنت، شوق اور جوش و ولولہ سے کام کر رہے ہیں، معلمی کے پیشہ سے نیک نامی کے ساتھ سبکدوش ہونے کے بعد وہ اردو کی خدمت، مادری زبان میں تعلیم کو فروغ دینے، مفید مضامین اور کارآمد کتابوں کی تالیف و تصنیف میں سرگرمی و جانفشانی سے لگے ہوئے ہیں، اس وقت وہ اپنی ڈائری مرتب کر رہے ہیں، جس کا یہ آخری حصہ چھپا ہے، جو ایک ماہ سے بھی کم عرصہ یعنی ۲۵ مئی تا ۲۳ جون ۱۹۸۶ء کا روزنامچہ ہے، وہ جن کتابوں، رسالوں اور ان کے خاص نمبروں کا مطالعہ کرتے رہے ہیں، اس میں ان کے مندرجات کے خوب و ناخوب کا ماہرانہ جائزہ لیا ہے، اس کے علاوہ اردو کی خدمت اور اس کی تعلیم کے فروغ کے جس کام کے لیے انھوں نے اپنی زندگی وقف کی ہے اسکی اہمیت اور مشکلات بتائی ہیں اور اگر کسی علمی و تعلیمی شخص سے ان کی ملاقات اور ضروری گفتگو ہوئی ہو، تو اسکو بھی پیش کیا ہے، اس حیثیت سے اس ڈائری کی نوعیت دوسری ڈائریوں سے مختلف ہے، اور اس میں علمی تعلیمی اور تہذیبی مسائل زیر بحث آئے ہیں، جو دراصل ایک معلم کے مطالعہ و تجربہ کا نچوڑ ہیں۔

"ض"

جلد ۱۴۰ ماہ صفر المظفر ۱۴۰۸ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۸۷ء عدد ۴

مضامین

مقالات